الاؤ انگارے آنچ

جرم سزا پر مبنی سچی کہانیاں

انسپکٹر ریٹائرڈ نواز خان

پہلا مجموعہ

الاؤ انگارے آنچ

پہلا مجموعہ

○

جُرم و سزا پر مبنی سچّی کہانیاں

○

انسپکٹر (ریٹائرڈ) نواز خان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

باراوّل مارچ ۱۹۸۶ء

قیمت —— ۲۰ روپے

ناشر : امجد رؤف خان سیّارہ ڈائجسٹ
۱۸۹۔ ریواز گارڈن لاہور

طابع : اللہ والا پرنٹرز، شاہراہِ قائداعظم لاہور

فہرست

آخری کوشش	۷
الاؤ انگارے آنچ	۳۹
زرینہ کے لئے	۶۹
سیتا، سیٹھ اور کامنی	۹۳
اک مرلہ زمین	۱۱۷
سنہرے خواب	۱۳۹

انتساب

اپنے نوجوان دوست طاہر جاوید مُغل کے نام ....

پیش لفظ

جب سے بھولی بسری یادوں کو چھیڑا ہے، آنکھوں کے سامنے کہانیوں کی ایک دُنیا آباد ہوگئی ہے۔ لاتعداد دھندلے اور روشن چہرے نگاہوں میں گھُوم رہے ہیں۔ ہر رنگ اور ہر وجہ کے چہرے، لاشوں کے چہرے، لاشوں پہ کھڑے ہو کر قہقہے لگانے والوں کے چہرے، لڑنے والوں اور لڑ مرنے والوں کے چہرے، آنسو بہانے ہوتے معصوم بچّوں کے چہرے، آنسو پیتے ہوتے مجبور بوڑھوں کے چہرے، مار کھا کر چیخنے والے مجرموں کے چہرے، عزّت لٹا کر لوٹنے والی عورتوں کے چہرے، حسین اور جوان چہرے، بدصورت اور ظالم چہرے، مشتبہ چہرے، مُلاقاتی چہرے، فریادی چہرے..... دیہات کی زندگی میں کیا کچھ نہیں ہوتا اور ایک فرض شناس پولیس والے پر کیا نہیں بیتتی؟ آج چہروں کی اس بھیڑ میں سے چند چہرے میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ دیکھئے اور فیصلہ کیجئے آپ کا اپنا چہرہ کس چہرے سے ملتا ہے۔

نواز خان

کچھ کتاب کے بارے میں

ہر عہد میں جُرم و سزا کے مسئلے پر غور و فکر ہوا ہے۔ جُرم کیا ہے؟ مُجرم کون ہے؟ اور اُسے سزا کون دے گا؟ دُنیا بھر کے ذخیرۂ نثر میں سب سے زیادہ اسی موضوع پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔

دوستوفسکی ہو یا آسکر وائلڈ، سلمان رشدی ہو یا یاشر کمال جُرم و سزا ان کی تحریروں کا ایک لازمی حصّہ ہے۔ یہ کتاب بھی اسی نوعیت کی ایک کوشش ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اسے خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوگی۔

مستنصر حسین تارڑ

آخری کوشش

Waqar Azeem

گرمیوں کے دِن تھے۔ گندم کی کٹائی ہو رہی تھی۔ دیہات کی فضا میں پکّی ہوئی فصل کی خوشبو رچی تھی۔ ایک رات کھانا وغیرہ کھا کر میں چھت پر آیا تو ہوا بالکل تھمی ہوئی تھی۔ کہیں درخت کا کوئی پتّا بھی نہیں ہلتا تھا۔ سارے دِن کے تھکے ہارے لوگ کھانا کھاتے ہی سونے کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہلکی ہلکی ہوا چلنی شروع ہوئی۔ نجانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ رات کسی پہر شور سُن کر میں جاگ اُٹھا۔ قریب ہی میرے بیوی بچّے بے خبر سوتے ہوتے تھے۔ میں نے اِردگرد دیکھا اور تب مجھے احساس ہوا کہ کچھ عجیب طرح کی روشنی در و دیوار پر پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے چونک کر شمال کی طرف دیکھا۔ دُور کھیتوں کے درمیان آگ کا ایک بڑا الاؤ نظر آ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں دیہاتی لاٹھیاں سنبھالے کھیتوں کی طرف بھاگتے دکھائی دے رہے تھے۔ اب میری بیوی بھی جاگ گئی تھی اور حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ میں نے تکیے کے نیچے سے اپنا ریوالور نکالا اور سیڑھیاں

بھلا لگتا ہوا نیچے آگیا۔ جونہی میں گھر سے نکل کر گلی میں پہنچا ایک بھاری بھرکم شخص بھاگتا ہوا مجھ سے ٹکرایا۔ میں فوراً پہچان گیا۔ وہ میرا مُخبر بلال شاہ تھا، لیکن بلال شاہ نے مجھے نہیں پہچانا۔ وہ تیر کی طرح سیدھا نکلتا چلا گیا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر جائے حادثہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ جس وقت میں کھیتوں میں پہنچا آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ کسی شقی القلب نے گندم کی کٹی ہوئی فصل کو آگ لگا دی تھی فصل کا مالک ریاست نامی ایک نوجوان تھا۔ وہ اپنی بربادی کا منظر دیکھ کر دیوانوں کی طرح بال نوچ رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے اُسے بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا اور حوصلہ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ موقع پر پہنچنے والے دیہاتی آگ سے بچی ہوئی گندم کو جلتی ہوئی گندم سے علیحدہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھے، لیکن آگ اتنی تیزی سے پھیلی تھی کہ وہ چند گٹھے نکالنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ ذرا سی دیر میں ایک کسان کی سال بھر کی محنت جل کر راکھ ہوگئی۔

ریاست نامی جس نوجوان کی فصل کو آگ لگائی گئی وہ گاؤں کا ایک خوشحال اور محنتی کاشتکار تھا۔ کوئی دو سال پہلے اُس کا باپ فوت ہوا تھا۔ دو مربعے زمین اُس کے حصے میں آئی تھی وہ خود ہی اس کو کاشت کر کے اپنی بوڑھی ماں اور جوان بہن کی کفالت کرتا تھا۔ میں اُن دنوں رام پورہ تھانے میں نیا نیا آیا تھا اور ریاست وغیرہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن میں نے لوگوں سے سُن رکھا تھا کہ ریاست کی بہن بڑی خوبصورت ہے۔ میرے مخبر بلال شاہ نے بھی شاید ایک دو بار اس کا تذکرہ کیا تھا۔ بلال شاہ اس قسم کے قصے بڑے مزے لے کر اور تفصیل سے سُنایا کرتا تھا۔ لیکن اس لڑکی کے بارے میں اُس نے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی تھی۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ

لگایا تھا کہ لڑکی خوبصورت ہونے کے ساتھ نیک سیرت اور باوقار بھی ہے۔

خیر لڑکی کا تذکرہ تو یونہی درمیان میں آگیا۔ میں بات کر رہا تھا گندم کو لگائی جانے والی آگ کی۔ اگلے روز ریاست گاؤں کے نمبردار اور چند دوسرے افراد کے ساتھ پرچہ کٹانے کے لئے تھانے آیا۔ اُس بیچارے کی حالت بہت پتلی ہو رہی تھی۔ خُون پسینے سے سینچی ہوئی فصل کسان کو بچوں کی طرح عزیز ہوتی ہے۔ اِس نوجوان کے چہرے پر بھی وہی دُکھ نظر آ رہا تھا جو جوان اولاد کی موت پر بدنصیب باپ کے چہرے پر دکھائی دیتا ہے۔ میں نے اُس سے مشکوک افراد کے بارے میں پُوچھا تو اُس نے گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار پریم سنگھ اور اُس کے بیٹوں کے نام لکھوائے۔ کچھ دن پہلے اِن لوگوں سے پانی کی باری پر ریاست علی کا جھگڑا ہوا تھا۔ بات بڑھ کر ہاتھا پائی تک پہنچی تھی اور ایک دو افراد کے سر بھی پھٹے تھے۔ اس روز میں نے پریم سنگھ اور اس کے بڑے بیٹے کو تھانے میں طلب کیا۔ پہلی نظر میں پریم سنگھ مجھے ایک لمبا تڑنگا جھگڑالو اور شرارتی سکھ دکھائی دیا۔ ایک گھنٹے کی گفتگو میں میں نے ہر طرح اُنہیں کریدنے کی کوشش کی لیکن وہ اِس واردات سے لاعلمی کا اظہار کرتے رہے۔ بہرحال پریم سنگھ سے ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ اُس نے بتایا چند روز پہلے ایک اور شخص سے بھی ریاست کا جھگڑا ہوا تھا۔ یہ نوجوان ریاست کا خالہ زاد بھائی مُراد ہے اور اس قصبے میں رہتا ہے۔ سُنا ہے کہ وہ ریاست کی بہن شادو کے عشق میں مُبتلا ہے وہ اکثر اُن کے گھر آتا جاتا رہتا تھا لیکن کچھ عرصے سے اُس کا آنا جانا بند ہوگیا ہے۔ پریم سنگھ نے بتایا کہ ایک روز شادو بھائی کے لئے کھیت میں روٹی لے کر آئی تو مُراد بھی وہاں آ گیا۔ تھوڑی دیر وہ تینوں بیٹھے رہے پھر اچانک اُن کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لڑکی

خاموش بیٹھی تھی اور وہ دونوں زور زور سے بول رہے تھے۔ مُراد کی آواز سنائی دی وہ جاتے جاتے کہہ رہا تھا۔ "میں لعنت بھیجتا ہوں تم سب پر۔ اور یاد رکھنا اِس بے عزّتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ بلال شاہ حسبِ معمول اُونچی آواز میں بولتا ہوا تھانے میں داخل ہوا۔ وہ بڑی روانی سے کسی کو صلواتیں سُنا رہا تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ رات جب میں گلی میں نکلا تھا تو بلال شاہ میرے ساتھ ٹکرایا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے میں داخل ہوا۔

"خان صاحب! رات تو بیڑا ہی ہو گیا" وہ دھم سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اب ذرا اس بیڑے کی تفصیل بتا دو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اِس کے بعد بلال شاہ نے ہاتھ نچا نچا کر اپنے مخصوص ڈرامائی انداز میں جو طویل کہانی سُنائی اس کا لُبِ لباب یہ تھا کہ رات جب آگ لگی بلال شاہ دوڑتا ہوا موقع پر پہنچا۔ اُس نے وہاں ایک شخص کو افراتفری میں بھاگتے ہوئے دیکھا۔ بلال شاہ تاڑ گیا کہ یہ شخص مجرم یا مجرموں کا ساتھی ہے۔ اُس نے فوراً اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ وہ شخص گاؤں کے اندر سے ہوتا ہوا پرلی جانب نکل گیا۔ بلال شاہ کے مطابق یہ تعاقب کم و بیش دو میل تک جاری رہا اور بلال شاہ کا بیڑا ہو گیا۔ لیکن مکمل "بیڑا" اُس وقت ہوا جب بھاگنے والا شخص مجرم کی بجائے بلال شاہ کا ایک لنگوٹیا یار نکلا۔ گاؤں سے باہر ایک ویران جگہ جا کر وہ کھڑا ہو گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہانپتے کانپتے بلال شاہ نے اُسے پکڑ لیا اور تب اُسے پتہ چلا کہ یہ اُس کا دوست شیدا کمہار ہے جو اپنے مفرور

گدھے کے پیچھے نکلا ہوا ہے۔ دراصل جس وقت آگ بھڑکی قریب ہی بندھا ہوا شیدے کا گدھا رسّی تڑوا کر بھاگ نکلا۔ اب گاؤں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر گدھا اُسے جُل دے کر کہیں غائب ہو گیا تھا اور وہ ہونقوں کی طرح مُنہ اُٹھائے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ قصہ مختصر شیدے نے بلال شاہ کو گدھے کی تلاش میں اپنے ساتھ شریک کر لیا — ایک اور دو گیارہ ہوتے ہیں۔ کئی ناکام چھاپوں کے بعد رات کوئی ایک بجے اُنھوں نے گدھے کو پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے گاؤں واپس لائے۔ اِس سارے واقعے میں میرے لئے صرف ایک کام کی بات تھی اور وہ تھی شیدے کمہار کی موقع پر موجودگی۔ بلال شاہ کی بات سے ظاہر تھا کہ شیدا بالکل ابتدائی لمحوں میں موقعہ واردات پر موجود تھا۔ میں نے اُسے تھانے بلوایا وہ بہت سہما ہوا تھا۔ وہ مجرموں کی تو کوئی نشاندہی نہ کر سکا لیکن مجھے احساس ہوا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے سوالوں کے جواب میں اُس نے بتایا کہ وہ آج کل کھیتوں میں کوڑا کرکٹ ڈال رہا ہے۔ کل رات اُس کے گدھے ریاست کے کھیتوں ہی میں بندھے ہوئے تھے۔ یہاں تک پہنچ کر شیدا ایک بار پھر ہچکچانے لگا۔ میں نے اُسے تھوڑا سا حوصلہ دیا تو وہ بولا۔

"تھانیدار جی۔ میں ریاست اور اُن کے گھر والوں کی بڑی عزّت کرتا ہوں۔ اپنی شادو بی بی بھی بڑی نیک اور سمجھ دار ہے۔ لیکن ایک لڑکا اُسے چکر دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔"

"ساری بات کھول کر بتاؤ۔ کون لڑکا ہے وہ" میں نے ذرا تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"جی.... مُراد نام ہے اس کا۔ اِن لوگوں کا کوئی رشتے دار ہے" پھر ذرا رُک

کر بولا" سرکار کل رات میرے جانور ریاست کے کھیتوں ہی میں بندھے ہوئے تھے۔ ریاست اور اُس کا ایک ساتھی گندم کے پاس ہی چارپائیاں ڈال کر سوتے تھے۔ کل رات ریاست کی ماں تو اُس کے پاس ہی بیٹھ گئی لیکن شادو اپنی ایک سہیلی کے ساتھ گندم کے گٹھوں کے قریب بیٹھ گئی۔ گٹھوں کے دوسری طرف میری چارپائی تھی۔ اور میں دونوں لڑکیوں کی آوازیں صاف سُن رہا تھا۔ شادو کی سہیلی بار بار اُس سے کوئی بات پوچھ رہی تھی۔ پھر شادو نے بتایا کہ کل مُراد کے ساتھ اُس کا جھگڑا ہو گیا ہے۔

دراصل مُراد چاہتا تھا کہ شادو رات کے وقت اُسے "جامنوں والے باغ" میں ملے۔ شادو نے جواب دیا کہ تایا کی لڑکی کی شادی ہونے والی ہے۔ وہاں جی بھر کر باتیں کر لینا۔ مُراد اپنی ضد پر اڑا رہا۔ شادو نے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ اپنے بھائی کی عزّت خطرے میں ڈال کر اُس سے ملنے نہیں آسکتی۔ اس بات پر مُراد ناراض ہو گیا۔ اور اُسے بُرا بھلا کہہ کر چلا گیا۔ اب شادو کی سہیلی اُسے مشورہ دے رہی تھی کہ وہ مُراد کو منا لے لیکن شادو کا کہنا تھا کہ وہ بڑے غصّے میں گیا تھا۔ مجھے اُس سے ڈر لگتا ہے دونوں سہیلیاں کافی دیر وہاں بیٹھی مُراد کی باتیں کرتی رہیں۔ آخر شادو کی ماں نے آواز دی اور وہ اُٹھ کر چلی گئی۔

میں بڑے غور سے شیدے کی باتیں سُن رہا تھا۔ اُس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ آگ کی واردات میں مُراد پر شک کیا جا سکتا ہے۔ اُس سے پہلے پریم سنگھ نے بتایا تھا کہ مُراد نے ریاست کو دھمکی دی تھی۔ اب پتہ چلا تھا کہ آگ لگنے سے صرف ایک روز پہلے ریاست کی بہن سے اس نے جھگڑا کیا تھا۔ اِس پُورے معاملے کو سمجھنے کے لئے مجھے مُراد اور شادو کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی

ضرورت تھی۔ میں نے مُراد کو بُلانے کے لئے اے ایس آئی گوبندرہ کو بھیجا لیکن پتہ چلا کہ وہ بیج خریدنے کے لئے شہر گیا ہے۔ وہاں اُسے ایک پیشی بھی بھگتنی ہے۔ ایک ہفتے سے پہلے اُس کے آنے کی اُمید نہیں۔ شادو کے بارے میں جاننے کے لئے میں نے گاؤں کی دائی "بھاگاں" سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ بھاگاں ایک قابلِ اعتماد عورت تھی اور اِس سے پہلے بھی میرے کئی کام کر چکی تھی۔ اُس نے چند روز میں ہی مجھے مطلوبہ معلومات بہم پہنچا دیں۔

اُس نے بتایا کہ ریاست کی بہن شادو اور مُراد ایک دوسرے سے محبّت کرتے ہیں۔ بچپن سے اُن کے رشتے کی بات چل رہی ہے لیکن ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ کچھ عرصے سے دونوں گھروں کے تعلقات خراب ہو گئے ہیں اور اب اُن کا رشتہ ہوتا نظر نہیں آتا۔ سب سے بڑی رکاوٹ ریاست کی ہے۔ وہ اِس رشتے کے حق میں نہیں۔ اس کی ماں اپنی بہن کو لڑکی دینا چاہتی ہے لیکن بیٹے کی وجہ سے مجبور ہے۔ بیچاری لڑکی دو گھرانوں کی لڑائی میں خواہ مخواہ پس رہی ہے۔ وہ اپنے تایا زاد سے محبّت کرتی ہے۔ لیکن دِل کی بات زبان پہ نہیں لاسکتی۔ وہ بڑی سمجھدار اور ماں باپ کی عزّت رکھنے والی لڑکی ہے۔ دائی بھاگاں نے بتایا کہ [illegible] رشتے کے جھگڑے نے [illegible] ہے۔ وہ ہر وقت گُم سُم سی رہتی ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ ریاست [illegible] خراب ہے۔ فصل کے نقصان نے اُس کی کمر توڑ دی ہے۔ اور پہلے والی خوشحالی اُن کے گھر میں کہیں نظر نہیں آتی۔

چند روز گزر گئے۔ میں نے کئی مشکوک افراد سے پُوچھ گچھ کی لیکن آگ لگانے والوں کا کوئی سراغ ہاتھ نہیں آیا۔ مُراد بھی ابھی تک گاؤں واپس نہیں آیا تھا۔ اس اثنا میں

میرے تھانے کے ایک دوسرے موضع میں قتل ہو گیا اور میں اس زیادہ اہم کیس کی تفتیش میں لگ گیا۔ قریباً دو ہفتے بعد کا واقعہ ہے۔ میں صبح تھانے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ باہر صحن میں کسی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ چند لمحے بعد اے ایس آئی گوبندر ایک نحیف و لاغر بڑھیا کو بازوؤں سے تھامے اندر داخل ہوا۔ چند اور افراد بھی اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ بڑھیا زار و قطار روتے ہوئے کسی کو کوسنے دے رہی تھی۔ اے ایس آئی گوبندر نے بتایا کہ یہ ریاست کی ماں ہے۔ رات اُن کے گھر میں چوری ہو گئی ہے۔ بڑھیا زمین پر بیٹھ گئی اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر میرے نام کی دہائی دینے لگی۔ پتہ چلا کہ چور دیوار پھاڑ کر اُس کی بیٹی کا سارا جہیز لے اڑے ہیں۔ میں نے اُسی وقت چند سپاہیوں کو ساتھ لیا اور بڑھیا کے ساتھ اُس کے گھر روانہ ہو گیا۔

جائے واردات پر پہنچ کر میں نے موقعہ کا تفصیلی جائزہ لیا۔ چور پہلے صحن میں داخل ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے ایک کمرے کی بغلی دیوار میں سوراخ کیا تھا اور وہاں سے سب کچھ نکال کر لے گئے تھے۔ ایک دو پارچہ جات ابھی تک صحن میں بکھرے ہوئے تھے۔ کمرے کے اندر ٹرنک کھلے پڑے تھے۔ چند ایک کم قیمت چیزیں ہی اُن کے اندر باقی رہ گئی تھیں۔ ایک جانب زیور کے لئے استعمال ہونے والے سُرخ رنگ کے خالی ڈبے ناکام آرزوؤں کی کہانی سُنا رہے تھے۔ بڑھیا ابھی تک اُونچی آواز میں بین کر رہی تھی "خدا غارت کرے ان دشمنوں کو، ہمارا گھر برباد کر دیا۔۔۔۔ پہلے فصل کو آگ لگائی پھر میری بیٹی کا جہیز لے گئے۔ اللہ کرے شام سے پہلے موت آئے اُن کو"۔ ریاست اور ایک نوجوان لڑکی بڑھیا کو کندھوں سے پکڑے اندر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے لڑکی کی صرف ایک جھلک دیکھی اور

پہچان گیا کہ یہی شادو ہے۔ وہ واقعی بہت حسین تھی۔ سوگواری نے اُس کے حسن کو عجیب طرح کی سنجیدگی دے دی تھی۔ میں نے اے ایس آئی گوبندر کی طرف دیکھا۔ وہ جائے واردات کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف تھا۔ قصبے کے دو کھوجی بڑی احتیاط سے کھُرا ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے مکان کے محلِ وقوع کا جائزہ لیا۔ یہ گھر دائیں بائیں سے دوسرے گھروں میں گھرا ہوا تھا۔ سامنے کی طرف سے کسی کے اندر گھسنے کا امکان بہت کم تھا۔ اس طرف گلی تھی اور گلی میں دیوار کے ساتھ ساتھ چار چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اگر چور اس طرف سے صحن میں گھسنے کی کوشش کرتے تو کسی نہ کسی کو ضرور خبر ہو جاتی۔ چور یقیناً عقبی سمت سے اندر آئے تھے۔ میں چکر کاٹ کر مکان کے عقب میں پہنچا۔ چھت کے منڈھیر وغیرہ دیکھے وہ بالکل سلامت تھے۔ دیوار پر کسی قسم کا کوئی اور نشان بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہاں چند گز پیچھے زمین پر ایک خراش سی نظر آ رہی تھی۔ جیسے کوئی چیز گھسیٹی گئی ہو۔ تمام تفصیلات نوٹ کرنے کے بعد میں تھانے آ گیا۔ ریاست اور اُس کے ایک دُور کے رشتے دار بھی میرے ساتھ ہی تھانے آئے تھے۔ انہوں نے چوری کا پرچہ درج کروایا۔ جب میں نے ریاست سے مشکوک افراد کے بارے میں پوچھا تو وہ حسب سابق ایک بار تھوڑا سا ہچکچایا۔ پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے اُس نے طویل سانس لی اور بولا۔

"جناب! مجھے شک ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ واردات میرے تایا کے لڑکے مُراد نے کی ہے"۔

میرے ذہن سے مُراد کا نام بالکل نکل چکا تھا۔ میں نے ریاست سے پوچھا کہ یہ لڑکا ابھی گاؤں آیا ہے یا نہیں؟

ریاست نے بتایا کہ وہ ابھی تک شہر ہی میں ہے۔ یہ بات اُسے اور بھی مشکوک کرتی تھی۔ بہرحال صرف اتنی بات پر اُسے مجرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ میں نے ریاست سے پُوچھا۔

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ واردات اُسی نے کی ہے؟"

ریاست نے کچھ کہنے کے لئے مُنہ کھولا لیکن پھر اُس کا چہرہ غصّے یا شرم کی وجہ سے سُرخ ہو گیا۔ اتنے میں اُس کے ساتھ آیا ہوا ایک بوڑھا شخص بولا۔

"میں اس کا چچا ہوں تھانیدار صاحب، میں آپ کو بتاتا ہوں۔ مُراد اچھے چال چلن کا لڑکا نہیں۔ اب تک ہم صرف اپنی عزّت کی وجہ سے خاموش تھے۔ اُس کے گھر والے ہم سے بیٹی کا رشتہ مانگتے تھے۔ لیکن ہم نے انکار کر دیا۔ وہ لڑکا اب بھی اس چکّر میں ہے اور دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ فصل کو آگ بھی اسی نے لگائی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو ریاست اپنی بہن کی ڈولی نہ اُٹھا سکے۔ ریاست اس کمائی پر بہن کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے مُراد اور اس کے ساتھیوں نے اس کی فصل جلا دی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ریاست نے اب بھی فیصلہ نہیں بدلا اور وہ جلدی بہن کے ہاتھ پیلے کر دے گا تو اس نے چوری کی اور جہیز کا سامان لے اُڑا۔ یہ تو شکر ہے اُسے موقع نہیں ملا، ورنہ وہ ہماری عزّت سے بھی کھیل جاتا۔ .... ہم اتفاق رائے سے بیان دیتے ہیں کہ فصل کے نقصان اور چوری کا ذمے دار مُراد ہے۔"

مراد کے خلاف پرچہ درج کرنے کے بعد میں نے اے ایس آئی گوبندر کو ایک چھاپہ مار پارٹی دے کر شہر روانہ کیا۔ اِس پارٹی نے مُراد کے چھوٹے بھائی کو بھی

ساتھ لے لیا تھا۔ دو دن کی بھاگ دوڑ کے بعد انہوں نے اُسے امرتسر کے ایک چھوٹے سے ہوٹل سے گرفتار کر لیا۔ میں اس وقت دفتر سے اُٹھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب گوبندر اُسے لئے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ مُراد نے سفید قمیص اور تہبند پہن رکھا تھا۔ وہ مضبوط جسم کا ایک دراز قد نوجوان تھا۔ لمبوترے چہرے پر باریک مونچھیں جچ رہی تھیں۔ اُس کے چہرے میں سب سے نمایاں چیز اُس کی آنکھیں تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی سو کر اُٹھا ہے۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے شک گزرا کہ شاید اُس نے نشہ وغیرہ کیا ہوا ہے۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ وہ سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اَب مجھے یاد پڑ رہا تھا کہ ایک دو دفعہ پہلے بھی میں نے اُسے قصبے میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ نکلتے ہوئے قد کی وجہ سے وہ فوراً نگاہوں میں آ جاتا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے خالص تھانیداری لہجے میں کہا۔

"مُراد علی جناب!" وہ گھبرایا ہوا تو تھا لیکن بہت زیادہ نہیں۔

"کیا کرتے ہو؟"

"تھوڑی سی زمین ہے جس پر محنت کرتا ہوں" جسم کے برعکس اس کی آواز کافی بھاری بھرکم تھی۔

"کل رات کہاں تھے تم؟" میں نے اچانک سوال کیا۔

اُس نے بڑے اعتماد سے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور کاغذوں کا ایک پلندہ سامنے میز پر رکھ دیا۔ میں نے گھور کر دیکھا اور کاغذوں کو اُلٹنے پلٹنے لگا۔ ان کاغذوں کے مطالعے سے مُراد کی پوزیشن کافی حد تک صاف ہو جاتی تھی۔ ڈسٹرکٹ کورٹ میں زمین کا ایک کیس چل رہا تھا جس میں مُراد علی فریق تھا۔ پیشی

کی تاریخیں بدلنے کی وجہ سے اُسے گاؤں واپس آنے میں دیر ہوگئی تھی۔ دوسری
بات جو مُراد کے حق میں جاتی تھی وہ یہ تھی کہ ریاست کے مکان کے پچھواڑے مٹ
نے زمین پر جو لکیر دیکھی تھی وہ کسی پیشہ ور چور کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ یہ لکیر کسی با
یا لمبی لکڑی کی وجہ سے آئی تھی۔ اُن دنوں چور یہ طریقہ بکثرت استعمال کرتے تھے
آج کل بھی دیہی علاقوں میں بعض چور اسی طرح چھتیں اور دیواریں پھلانگتے ہیں۔ پھلا
والا شخص دُور سے بھاگتا ہوا آتا ہے اور ایک بانس نما لکڑی زمین پر ٹیک کر چھ
پر چڑھ جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ کام کسی عام آدمی کے بس کا نہیں تھا اور دل
کوئی شہادت نہیں ملتی تھی جس سے پتہ چلتا ہو کہ مُراد اِس سے پہلے بھی چوریاں کر
رہا ہے۔ بہر حال تفتیش کے مرحلے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یں
نے پُوچھ گچھ کے لئے مُراد کو حراست میں لے لیا۔

قصبے کے ایک دو معزز افراد کی سفارشیں اُس کے ساتھ تھیں اِس لئے یں
اُس پر سختی کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ یں لگتا تھا کہ سیدھی انگلیوں سے یہ گھی نہیں نکے
گا۔ پہلے ایک دو گھنٹے تو وہ خوب صفائی پیش کرتا رہا۔ اُس نے یہ بات بالکل تسلیم نہ
کی کہ شادو سے اُس کا کوئی تعلق ہے۔ فصل کو آگ لگانے اور چوری کے جرم سے
بھی وہ انکاری تھا۔ جب مَیں نے سخت لہجے میں بات کی تو اُس نے چپ سادھ لی
مَیں ابھی اُس کی چپ توڑنے کے بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ چوہدری قاسم ریاست
کے ساتھ تھانے میں داخل ہوا۔ چوہدری قاسم سے میرا تعارف پچھلے ہی دنو
ہوا تھا۔ وہ اُن کا کوئی رشتے دار تھا۔ جب ریاست کی فصل کو آگ لگی تھی چوہدری
قاسم اُس کے ساتھ تھانے آیا تھا۔ وہ نزدیکی گاؤں "مہندی پور" کا چوہدری تھا

ور کافی اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ اُس نے قریب پہنچ کر گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور کرُسی
گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے گول سُرخ چہرے پر دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ
س کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ میرے بُلانے سے پہلے ہی اُس نے ایک سپاہی کو آواز
دی اور کہا کہ لسّی کا بندوبست کرے۔ میری اب تک اس سے دو تین مُلاقاتیں ہی
ہوئی تھیں لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ وہ خاصا خوش خوراک شخص ہے۔ میرا مُخبر بلال شاہ کافی
تنومند شخص ہے لیکن اُس جیسے تین نہیں تو ڈھائی آدمی اُس کے اندر سے ضرور نکلتے
تھے۔ عمر کوئی پنتالیس سال کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ لیکن صحت کافی اچھی تھی۔ مَیں نے
پہلی مُلاقاتوں میں اندازہ لگایا تھا کہ پولیس والوں سے دوستی کا اُسے جنون کی حد تک
شوق تھا۔ یوں بھی وہ ایک باخبر شخص تھا۔ اور علاقے کے حالات پر اُس کی گہری نظر
تھی۔ ایسے لوگوں سے رابطہ پولیس افسروں کے لئے بڑا سُود مند ثابت ہوتا ہے۔ چوہدری
قاسم کی ریاست سے گہری دوستی تھی۔ اِس مشکل وقت میں بھی وہی سب سے
زیادہ اُس کا ساتھ دے رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت بھی وہ ریاست کے لئے
کوئی خوشخبری لے کر آیا ہو گا۔ لسّی پینے کے بعد اُس نے بے تکلفی سے ایک طویل ڈکار
لی اور بولا۔

"خان صاحب آپ کے مجُرم کا کھُرا دبا لیا ہے مَیں نے۔ ذرا نہر کے پُل تک
چلنا ہو گا آپ کو۔"

کام کی بات تھی مَیں فوراً چلنے کو تیار ہو گیا۔ باہر چوہدری قاسم کا سجا سجایا تانگہ کھڑا تھا۔
ہمارے بیٹھتے ہی کوچوان نے چابک لگایا۔ نہر کی پٹڑی پر چلتے ہوئے ہم کوئی آدھ
گھنٹے میں پُل پر پہنچے۔ تانگے کے رُکتے ہی قاسم کا ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا اور اس سے

باتیں کرنے لگا۔ قاسم نے تھوڑی دُور نشیب میں جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔ شام ہو چکی تھی اور خانہ بدوش کھانا پکا رہے تھے۔ جھونپڑوں کے پاس اونٹ اور بھیڑیں وغیرہ بندھی نظر آ رہی تھیں۔ ہم چلتے ہوئے جھونپڑیوں کے پاس پہنچے۔ بستی کے مکین خوف زدہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے لیکن کسی کو کچھ پُوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ چوہدری قاسم کا آدمی ایک جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ ایک عمر رسیدہ عورت جھونپڑی سے برآمد ہوئی۔

"تمہاری لڑکی کہاں ہے مائی؟" چوہدری قاسم کے آدمی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

اتنے میں جھونپڑی کا پردہ ہلا اور ایک سانولے رنگ کی لیکن دلکش نقوش والی لڑکی برآمد ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں گھبراہٹ نظر آ رہی تھی۔ چوہدری قاسم نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ مَیں نے لڑکی اور اس کی ماں کو ایک طرف کھڑا ہونے کا حکم دیا اور اے ایس آئی گوبندر کو کہا کہ وہ جھونپڑی کی تلاشی لے۔ گوبندر چند سپاہیوں کے ساتھ جھونپڑی میں گھس گیا۔ لڑکی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اُس کی ماں بھی بُری طرح کانپ رہی تھی۔ چند لمحے بعد گوبندر ایک چھوٹی سی گٹھڑی اُٹھائے برآمد ہوا۔ گٹھڑی میں کچھ قیمتی کپڑے بندھے ہوئے تھے۔ ریاست نے فوراً پہچان لیا۔ یہ کپڑے اُس کی بہن کے سامان میں سے تھے۔ اپنے خون پسینے کی کمائی کون بھول سکتا ہے۔

ہم مسروقہ سامان کے ساتھ لڑکی اور اس کی ماں کو تھانے لے آئے۔ لڑکی خاص طور پر مجھ سے بہت خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ مَیں نے سختی سے پُوچھا تو اُس نے سب کچھ اُگل دیا۔ اُس نے اعتراف کیا کہ مُراد سے اُس کی جان پہچان ہے۔ وہ اکثر چوری چھپے اُس سے ملتی تھی۔ اُس نے مُراد کے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتایا۔ اُس نے کہا کہ مُراد کا

ئی اور عورتوں سے بھی یارانہ ہے لیکن وہ اُن کے نام نہیں جانتی۔ اُس نے بتایا کہ یہ کپڑے مُراد ہی نے اُسے تحفے میں دیئے تھے۔ مُراد کو اُس کے سامنے لایا گیا تو اُس نے لڑکی کو پہچاننے سے صاف انکار کر دیا۔ بہرحال ایک اہم ثبوت ہاتھ آ چکا تھا اور بش رفت یقینی تھی۔ مُراد کو گرفتار ہوئے چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ مَیں نے عدالت سے اس کا ریمانڈ لے لیا اور پُوچھ گچھ شروع کر دی۔ لڑکی سے ہمیں بہت قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ یوں بھی اُس کا قصور قابلِ دست اندازی پولیس نہیں تھا۔ مَیں نے ایک دو شخصی ہمانتیں حاصل کرنے کے بعد اُسے چھوڑ دیا۔

مُراد سے چونکہ مسروقہ مال برآمد کرانا تھا اس لئے سختی ضروری تھی۔ لیکن وہ بہت ہیٹ لڑکا ثابت ہو رہا تھا۔ مَیں نے بہت کم نوجوانوں کو اتنا سخت جان پایا تھا۔ ں نے دو دن اُس پر تھرڈ ڈگری استعمال کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ چیخنا چلانا ز اُسے آتا ہی نہیں تھا۔ خاموشی سے مار کھاتے کھاتے بیہوش ہو جاتا تھا۔ ہوش میں آتا تو سوئی سوئی آنکھوں سے عملے کے افراد کو دیکھنے لگتا تھا۔ پہلے پہلے تو مجھے اُس کے بھنے کے انداز پر سخت غصّہ آتا تھا لیکن اب مَیں سمجھ گیا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں رتا۔ چند دن بعد اُس کا ریمانڈ ختم ہو گیا۔ مَیں نے چالان مکمل کر کے عدالت میں پیش کر ا۔ لیکن شہادتیں کمزور تھیں۔ وہ کوئی ایک ماہ بعد ضمانت پر رہا ہو کر واپس آ گیا۔

ابھی اُسے جیل سے آئے ہوئے چند روز ہی گزرے تھے کہ قتل کا ایک واقعہ پیش یا۔ دوپہر سے کچھ پہلے چند دیہاتیوں نے تھانے آ کر اطلاع دی کہ نہر کے پُل کے پاس ہیارے کے کھیتوں میں کسی عورت کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ مَیں اور اے آئی ایس عدلی چند سپاہیوں کے ساتھ موقعۂ واردات پر پہنچے۔ کھیت کے ارد گرد بہت ... سے

لوگ جمع تھے لیکن کسی کو اندر جانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ احتیاط سے چلتے ہوئے جب ہم لاش والی جگہ پر پہنچے تو وہاں کوئی عورت اوندھے منہ زمین پر پڑی تھی۔ اُس کے جسم پر ایک سفید رنگ کا کھیس پڑا تھا اور سنہری بالوں کی گندھی ہوئی طویل چوٹی سانپ کی طرح کمر پر رکھی ہوئی تھی۔ اس چوٹی کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے پہلے بھی اس عورت کو کہیں دیکھا ہے۔ یہ بھی یاد پڑ رہا تھا کہ چند روز پہلے ہی ملاقات ہوئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا لاش کے قریب پہنچا۔ اُس کا چہرہ آدھ کھلے بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کھیس کے نیچے لاش بالکل برہنہ ہے۔ میں نے بڑی احتیاط سے اُسے سیدھا کیا۔ میرے سامنے وہی خانہ بدوش لڑکی پڑی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا اُس کی گردن پر اُنگلیوں کے گہرے نشان نظر آ رہے تھے۔ اُسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اس کی کلائیوں میں کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے دھنسے ہوئے تھے۔ سفید کھیس کے اُوپر جگہ جگہ خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ چہرے اور شانوں پر اُبھرے ہوئے نیلے نشان چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ ہلاک کرنے سے پہلے لڑکی کو درندگی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اُس کے رخساروں پر طمانچوں کے نشان بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ایک ہونٹ پھٹا ہوا تھا۔ اور ٹھوڑی کے قریب خون جم گیا تھا۔

میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لاش کو اے ایس آئی محمد علی کے حوالے کر کے میں سیدھا قصبے کی طرف روانہ ہوا۔ حالات جس شخص کو مشکوک ٹھہرا رہے تھے وہ مُراد تھا۔ وہ پرسوں ہی جیل سے رہا ہوا تھا۔ خانہ بدوش لڑکی رتی سے نہ صرف یہ کہ مسروقہ سامان برآمد ہوا تھا بلکہ اُس نے مُراد کے خلاف تفصیلی بیان بھی دیا تھا۔ ظاہر ہے مُراد کو اس بات کا رنج ہوگا۔

میں بڑی تیزی سے گھوڑا بھگاتا ہوا قصبے میں داخل ہوا۔ بلال شاہ کے علاوہ گوہندر بھی میرے ساتھ تھا۔ مُراد کے مکان کے سامنے پہنچ کر میں گھوڑے سے نیچے اُترا۔ گوہندر نے بندوق سیدھی کر لی تھی لیکن بندوق استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ میرے خدشے کے عین مطابق مُراد ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہو چکا تھا۔ گھر میں اُس کی والدہ اور چھوٹے بہن بھائی تھے۔ میں نے بوڑھیا سے پُوچھ گچھ کی لیکن وہ بار بار یہی کہتی رہی۔ میرے بیٹے کو مُعاف کر دو، وہ بے قصور ہے، اُس نے کچھ نہیں کیا۔ ماؤں کی نظر میں بیٹے ڈاکو اور قاتل بن کر بھی بے قصور ہی رہتے ہیں۔ لیکن اُن کے کہنے پر انہیں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے تھانے پہنچ کر۔ فوراً مُراد کی تلاش میں چھاپہ مار پارٹیوں کو روانہ کیا۔ ضروری کارروائی کے بعد خانہ بدوش لڑکی رتی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے امرتسر روانہ کر دیا گیا۔ اس کے قبیلے والے بڑے بپھرے ہوئے تھے۔ وہ انتقام انتقام کے نعرے لگا رہے تھے۔ اُن کے مردوں کی تعداد کسی طرح بھی ڈیڑھ سو سے کم نہیں تھی۔ وہ سب کے سب چھریوں کلہاڑیوں سے لیس اور بڑی جنگجو طبیعت کے مالک تھے۔ شام کے وقت میرے مُخبروں نے اطلاع دی کہ بہت ممکن ہے رات کو یہ لوگ مُراد کے مکان پر حملہ کر دیں۔

اس خبر نے مجھے تشویش میں مُبتلا کر دیا۔ میں نے مُخبر کو مزید معلُومات حاصل کرنے کے لئے واپس بھیج دیا۔ تھانے میں نفری بہت کم تھی۔ آدھے سے زیادہ عملے کو میں مُراد کی تلاش میں روانہ کر چکا تھا۔ دوپہر سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ڈیک نالے میں سیلاب آ گیا تھا اور رام پورے کا تھانہ دوسرے تھانوں سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس صورت میں اگر خانہ بدوش گاؤں پر حملہ کر دیتے تو انہیں روکنا بے حد دشوار ثابت ہوتا۔ حفاظتی اقدام کے طور پر میں نے مُراد کے گھر میں چند سپاہیوں کا پہرہ بٹھا دیا۔ اندھیرا پھیلنے تک پورے گاؤں میں

یہ افواہ پھیل گئی کہ آج رات خانہ بدوش گاؤں پر حملہ کر دیں گے۔ پُورے گاؤں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ تھانے میں اس وقت صرف ایک رائفل اور ایک پستول تھا۔ پُورے گاؤں میں ایک بھی پکی رائفل نہیں تھی۔ دیسی ساخت کی صرف ایک بندوق نمبردار کے پاس تھی۔ گاؤں کے چند نوجوان برچھیوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہو کر آ گئے تھے۔ لیکن خانہ بدوش کے مقابلے میں اس مختصر سے جتھے کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ پُورا گاؤں مُراد کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ وہ لڑکی کو قتل کرنے کے بعد خود تو فرار ہو گیا تھا۔ لیکن اپنے گھر والوں سمیت پُورے گاؤں کو مصیبت میں ڈال گیا تھا۔

مُراد کا گھر گاؤں کی بیرونی حدود میں واقع تھا۔ یہاں سے نہر کا پُل کوئی ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ درمیان میں کھیتوں کا ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش مُسلسل ہو رہی تھی۔ مَیں نے اے ایس آئی گوبندر کو بندوق دے کر مُراد کے مکان کی چھت پر بٹھا رکھا تھا۔ دو اور سپاہی بھی اُس کے ساتھ تھے وہ پُل کی طرف گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ خانہ بدوش چکر کاٹ کر پیچھے سے گاؤں کی دوسری جانب سے حملہ کر دیں۔ دس نوجوانوں اور دو سپاہیوں کی ٹولی کو اُس جانب کی نگرانی پر رکھا گیا تھا۔ نمبردار اپنی دیسی ساخت کی بندوق کے ہمراہ اُن کے ساتھ تھا۔ اپنے طور پر ہم نے انتظامات کئے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ اگر خانہ بدوشوں نے حملہ کیا تو لوگوں کے جان و مال کی حفاظت مشکل ہو جائے گی۔ مَیں اپنے پستول سے صرف دس فائر کر سکتا تھا۔ اتنی ہی گولیاں گوبندر کے پاس تھیں۔ باقی رہی دیسی بندوق تو وہ کبھی چلتی تھی کبھی نہیں چلتی تھی۔ چاروں طرف گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ بارش گرنے کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

مَیں دُعا مانگ رہا تھا خُدا کرے یہ رات خیریت سے گزر جائے۔

رات کوئی دس بجے گاؤں کی شمالی جانب سے شور بلند ہوا۔ لوگوں کے بولنے اور بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آئیں کوئی دس منٹ بعد چوہدری قاسم اپنے بھاری بھرکم جسم کے ساتھ ڈولتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اُس کا گول سُرخ چہرہ جُوش سے تمتا رہا تھا۔ "مَیں آ گیا ہوں خان صاحب۔" ایسی کی تیسی اِن ٹپری واسوں (خانہ بدوشوں) کی وہ کندھے سے لٹکی ہوئی بارہ بور کی رائفل تھپتھپا کر بولا۔ کمر سے اُس نے گولیوں کی پیٹی اڑس رکھی تھی۔ اُس کے ساتھ کوئی تیس آدمی اور تھے۔ یہ سب کلہاڑیوں، برچھیوں سے مسلح تھے۔ چار پانچ کے پاس رائفلیں بھی تھیں۔ دراصل یہ ریاست کا کارنامہ تھا۔ وہی مجھ سے اجازت لے کر شام کے وقت مہندی پُور گیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ چوہدری قاسم یاروں کا یار ہے۔ وہ اُس کی مدد کو ضرور آئے گا۔ تمام افراد کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تیر کر گاؤں پہنچے ہیں۔ دو افراد کے سر پر پٹیاں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ پتہ چلا کہ جس وقت یہ لوگ گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے۔ کسی مکان سے اُن پر خشت باری ہونے لگی۔ مَیں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ بلال شاہ کا کارنامہ ہے جس جگہ یہ افراد زخمی ہوئے تھے۔ وہاں بلال شاہ ہی "تعینات" تھا۔ اندھیرے میں اُس نے بغیر پہچانے ان پر اینٹیں برسانی شروع کر دی تھیں۔ اینٹیں پھینکنے کا کوئی موقعہ اُس نے آج تک ہاتھ سے نہیں گنوایا تھا۔

چوہدری قاسم کے پہنچنے کی خبر فوراً سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگوں کو کسی حد تک اطمینان ہوا۔ صرف ایک شخص ایسا تھا جو چوہدری قاسم کی آمد پر سخت جھلایا ہوا تھا اور وہ تھا پریم سنگھ۔

پریم سنگھ کی ریاست سے دشمنی تھی اور چوہدری قاسم، ریاست کی یاری کا دم بھرتا

تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پریم سنگھ مسلسل چوہدری قاسم کو گھور رہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ ایک کونے میں بیٹھا کرپان ہاتھ میں گھما رہا تھا اس کی سرخ سرخ آنکھیں بڑی دیر سے چوہدری قاسم پر جمی ہوئی تھی۔ لڑنے والے کو کسی بہانے کی ضرورت ہی ہوتی ہے۔ چوہدری قاسم کے ایک آدمی نے حقے کا دھواں پریم سنگھ کی طرف چھوڑ دیا۔ پریم سنگھ تن کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے ایک زناٹے کا تھپڑ اس آدمی کے منہ پر جڑا اور حقہ پکڑ کر صحن میں پھینک دیا۔ چوہدری قاسم نے پہلے تو حیرانگی سے میری طرف دیکھا۔ پھر اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔ وہ پریم سنگھ کے پاس پہنچا۔ جونہی اس نے تھپڑ رسید کرنے کے لئے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ تین چار سپاہی فوراً اندر آ گئے اور انہوں نے مشتعل افراد کو پیچھے پیچھے ہٹا دیا۔ اتنے میں چھت سے گوبندر کی آواز آئی۔ وہ مجھے فوراً چھت پر آنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے کوئی خطرہ نظر آیا ہے۔ میں نے تیز نظروں سے پریم سنگھ اور چوہدری قاسم کی طرف دیکھا۔ وہ میری نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے پیچھے پیچھے ہٹ گئے۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر پہنچا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ بارش کچھ ہلکی ہو گئی تھی۔ اے ایس آئی گوبندر بڑے غور سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دور انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے مجھے کہا کہ کافی دیر سے دو تین روشنیاں نہر کے پل کے پاس نظر آ رہی ہیں۔ میں نے بھی غور سے دیکھا۔ روشنیاں واقعی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن وہ ایک جگہ ٹھہری ہوئی تھیں۔ میں تھوڑا سا آگے بڑھ کر چھت کی منڈھیر پر پہنچا۔ اچانک مجھے دیوار کے بالکل نزدیک آہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے جھک کر نیچے دیکھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ دور تک کئی افراد چپکے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں پیچھے ہٹتا رسّی کی طرح کی کوئی چیز میری گردن سے لپٹ گئی۔ عین اس وقت میں نے

گوبندر کی چیخ سنی۔ کسی نے عقب سے اسے دبوچ لیا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن کمند پھینکنے والے نے مجھے گلی میں چھلانگ لگانے پر مجبور کر دیا۔ گردن میں اٹھنے والی شدید ٹیس نے میرے جسم میں انگارے بھر دیئے تھے۔ میرے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ نکلی اور میں نے سامنے آنے والے شخص کو لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ دو افراد کلہاڑیاں لہراتے ہوئے میری طرف لپکے۔ خوش قسمتی سے میرا پستول ہولسٹر سے نکلا نہیں تھا۔ میں نے پستول نکالا، ایک حملہ آور کا وار نیچے جھک کر بچایا اور دیوار کے ساتھ پشت لگا کر تین فائر کئے۔ گولیاں حملہ آوروں کی ٹانگوں پر لگیں اور وہ زمین پر گر گئے۔ اتنے میں مکان کے اندر سے چوہدری قاسم اور دوسرے مسلّح افراد باہر نکل آئے۔ چھت کے اوپر سے بھی سپاہیوں نے گلی میں چھلانگیں لگا دیں۔ برچھیاں لہرائیں لاٹھیوں کے ٹکرانے کی آوازیں آئیں۔ تین چار کراہیں سنائی دیں۔ ایک آدھ فائر بھی ہوا۔ اتنے میں گاؤں کی شمالی جانب پہرہ دینے والے افراد بھی لاٹھیاں لہراتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ لیکن ان کے پہنچتے پہنچتے کھیل ختم ہو چکا تھا۔ خانہ بدوش اچانک اور شدید مزاحمت سے گھبرا کر بھاگ نکلے تھے۔ میری گولیاں کھا کر گرنے والے تین افراد کیچڑ میں پڑے لوٹ رہے تھے۔ تھوڑی دور چار اور افراد زمین پر گرے پڑے تھے۔ کوئی دس خانہ بدوشوں کو گاؤں والوں نے پکڑ لیا تھا۔ مخبر کی بروقت اطلاع نے نہ صرف مراد کے گھر بلکہ شاید کئی اور گھروں کو بھی پامال ہونے سے بچا لیا تھا۔ جوابی حملہ اتنا زوردار تھا کہ خانہ بدوش ایک لمحے کے لئے بھی جم کر نہ لڑ سکے۔ ان کے چھ افراد زخمی ہوئے تھے لیکن خوش قسمتی سے کوئی جان ضائع نہیں ہوئی تھی۔ گرفتار ہونے والوں میں دو عورتیں بھی شامل تھیں۔ ایک عورت تو وہی تھی جس نے کمند ڈال کر مجھے چھت سے گلی میں گرایا تھا۔ میں نے بھی آخر تک اس کا گریبان نہیں

چھوڑا تھا۔ جب خانہ بدوش بھاگنے لگے تو اُس نے پُوری قوّت سے میرے ہاتھ پر کاٹ کھایا لیکن میں لٹھ سے مس نہ ہؤا۔ بعدازاں مجھے معلُوم ہؤا کہ وہ قتل ہونے والی رنّی کی چھوٹی بہن ہے۔ وہ بھی بہن کی طرح خوبصورت رہی ہوگی۔ لیکن مَیں نے بے خبری میں اُسے جو زوردار گھونسے مارے تھے۔ اُنہوں نے اس کا مُنہ پُھلا کر کُپّا کر دیا تھا۔ بعد میں مجھے اس پر ترس بھی آیا۔ دونوں عورتوں کو اگلے دِن رہا کر دیا گیا۔ خانہ بدوشوں کے سردار سے بات چیت کے بعد میں نے باقی افراد کو بھی چھوڑ دیا۔ صرف تین یا چار آدمیوں پر مقدمہ چلا اور انہیں سزا ہوئی۔

اِس لڑائی میں گاؤں کے جو دو افراد زخمی ہوئے اُن میں سے ایک ریاست بھی تھا۔ اُس کی ران میں برچھی کا گہرا زخم آیا تھا۔ برسات کے دن تھے۔ چند روز میں اُس کا زخم بہت خراب ہوگیا۔ اور اُسے امرتسر ہسپتال لے جانا پڑا۔ دِن گزرتے رہے۔ مُراد کو اشتہاری مجُرم قرار دے دیا گیا تھا۔ مَیں رات دن اُسے گرفتار کرنے کی کوشش میں تھا۔ لیکن کامیابی کی کوئی صُورت نظر نہیں آتی تھی۔ ایک دِن اسی کیس کے سلسلے میں امرتسر گیا تو ریاست کی عیادت کے لئے ہسپتال بھی پہنچا۔ وہ بہت کمزور ہوگیا تھا۔ اور زخم میں پیپ بھر گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ رونے لگا۔ بیماری نے اُس کی رہی سہی ہمّت بھی توڑ دی تھی۔ اُس نے بتایا کہ گھر کی حالت بہت پتلی ہے۔ اگر چوہدری قاسم اُس کے گھر کی خبرگیری نہ کرتا تو اُس کی ماں اور بہن در بدر ہو جاتیں۔ اُس کی بہن شادو بھی اس کے پاس ہی بیٹھی ہوتی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ بڑی افسردہ نظر آ رہی تھی۔ دائی بھاگاں نے بتایا تھا کہ مُراد اب اُس کے دِل سے اُتر گیا ہے۔ وہ اُس سے نفرت کرنے لگی ہے، لیکن مجھے پتہ تھا کہ لڑکیوں کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ عورت کب محبت کرتی ہے اور

کب نفرت یہ صرف وہی جانتی ہے اور کوئی نہیں جان سکتا۔ اچانک میں اپنے خیالوں سے چونک اُٹھا۔ چوہدری قاسم ایک نوکر کے ساتھ پھلوں کا ٹوکرا لئے ہوئے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اُس نے ٹوکرا زمین پر رکھ دیا۔ پھر اُس کی نظر پہلی بار شادو پر پڑی۔ اُس کی نظر کا انداز دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اُس کی آنکھوں نے ایک ہی لمحے میں مجھے حرص و ہوس کی ایک طویل داستان سُنا دی تھی۔ مَیں اپنے تجربے کی بُنیاد پر پُورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ چوہدری قاسم ریاست کی بہن کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اپنے خیال پر خود بھی حیرت ہوئی۔ چوہدری قاسم کی عمر کسی طرح پینتالیس چھیالیس سے کم نہیں تھی۔ مَیں جو اُٹھنے کا فیصلہ کر رہا تھا چوہدری قاسم کی آمد پر پھر جم کر بیٹھ گیا۔ چوہدری بڑا کھِلا ہؤا تھا۔ مونچھوں کو بار بار بل دے رہا تھا اور ذرا ذرا سی بات پر اُس کے ہونٹوں سے ہنسی اُبلنے لگتی تھی۔ ہنستے ہوئے اُس کی بھاری بھرکم توند زور زور سے ہلتی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ بھی اُس کے ساتھ قہقہے لگا رہی ہے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں سُرخ ڈورے اُس کی رنگین مزاجی کی داستان سُنا رہے تھے۔ گفتگو کے دوران وہ گاہے گاہے دزدیدہ نگاہوں سے شادو کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ شادو کی پلکیں جُھکی ہوئی تھیں اور وہ بے خیالی میں ہولے ہولے بھائی کا بازو دبا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ چوہدری کی پُر ہوس نگاہوں کی تپش اپنے چہرے پر محسُوس کر رہی ہے چوہدری قاسم کی زندگی کا یہ پہلو اس سے پہلے میری نظروں سے بالکل اوجھل تھا۔ اب جبکہ یہ میرے سامنے آیا تھا۔ میرا ذہن کسی اور ہی انداز سے سوچنے پر مجبُور ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے ریاست کو پیش آنے والے واقعات کے سلسلے میں صرف دو مشکوک نام میرے ذہن میں تھے۔ ایک مُراد اور دوسرا پریم سنگھ لیکن اب ان میں ایک تیسرا

نام شامل ہوگیا تھا، چوہدری قاسم۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ سارا کھیل چوہدری قاسم کا کھیلا ہُوا ہو۔ وہ چاہتا ہو... وہ شادو کو چاہتا ہو۔ اِس کے لئے اُس نے ایک منصوبہ بنایا ہو اور اب . . . . . اَب اُس کی بہن سے شادی رچانا چاہتا ہو . . . . . اور پھر دفعتاً میرے ذہن میں ایک ایسی بات آئی کہ میں خود بخود کرُسی سے کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں موجُود افراد حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔

"اچھا مَیں چلتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔" مَیں نے اپنی ٹوپی سنبھالتے ہوئے کہا۔ مَیں جلد از جلد تنہائی میں پہنچ کر کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ باہر کوچوان تانگے میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ مَیں پچھلی نشست پر بیٹھ گیا اور اس کہانی کا تانا بانا بُننے لگا۔ مجھے کوئی ایک ماہ پہلے کی ایک بات یاد آئی تھی۔ رام پورہ میں مجھ سے پہلے جو انسپکٹر فرائض انجام دیتا تھا وہ آج کل جالندھر کے ایک نواحی تھانے میں تھا۔ اُس سے میری مُلاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں چوہدری قاسم کا ذِکر آیا۔ اُس نے مجھے چوہدری قاسم کے اثر و رسوخ سے آگاہ کیا اور بتایا کہ بڑا کام آنے والا آدمی ہے۔ اُس نے چوہدری کی ایک دلچسپ بات سناتے ہوئے کہا کہ کچھ عرصہ پہلے شادی بیاہ کی ایک تقریب میں کسی لڑکی نے چوہدری کو "بھا آلو" کہہ دیا۔ اس لڑکی کا نام رانی تھا اور وہ چوہدری کی کوئی دُور کی رشتے دار تھی۔ چوہدری کو اِس کی بات کا بہت غصّہ تھا۔ وہ مجھ سے بہت بے تکلّف تھا۔ اکثر کہا کرتا تھا کہ اگر وقت نے ساتھ دیا تو وہ اس رانی کو دِل کی "رانی" بنا کر چھوڑے گا . . . . .

مَیں جان گیا تھا کہ وہ رانی کون تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب مَیں ریاست کے پاس بیٹھا تھا۔ اُس نے شادو سے کہا تھا رانی مجھے ذرا اُٹھا کر بٹھاؤ . . . . . شادو کا

اصلی نام رانی تھا۔ ایک ایک کر کے واقعات کی تمام کڑیاں جڑتی جا رہی تھیں۔ چوہدری اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے معصوم و بے گناہ لڑکی سے انتقام لینے جا رہا تھا۔ وہ اُس سے شادی رچانا چاہتا تھا۔ اُس کے لئے اُس نے پہلے ریاست سے اُس کی خوشحالی چھینی۔ پھر ایک تیر سے دو شکار کرتے ہوئے اپنے رقیب کو راستے سے ہٹا دیا۔ اُس نے چوری کا الزام مُراد کے سَر لگوا دیا۔ اُس نے خانہ بدوش رتی سے مِل کر ایک چال چلی۔ اس چال نے نہ صرف مُراد کو چور ٹھہرایا بلکہ اُسے شادو کی نظروں سے بھی گرا دیا۔ بعد ازاں کسی وجہ سے جھوٹی گواہی دینے والی رتی کے ساتھ چوہدری کی ان بن ہو گئی۔ ہو سکتا ہے رتی نے دھمکی دی ہو کہ وہ ساری بات پولیس کو بتا دے گی۔ چوہدری نے اُسے پولیس تک پہنچنے سے پہلے ہی درندگی کا نشانہ بنا کے قتل کر ڈالا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر دُوہرا فائدہ حاصل کیا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی کے قتل کا الزام مُراد کے سَر آئے گا۔ ایسا ہی ہُوا۔ مُراد خود کو پولیس کی گرفتاری سے بچانے کے لئے روپوش ہو گیا۔ شادو کو جیتنے کے لئے اب میدان صاف تھا۔

جب خانہ بدوشوں نے حملہ کیا تو چوہدری بڑی جوانمردی کا ثبوت دیتے ہوئے گاؤں والوں کی مدد کو آگیا۔ حالات نے اُسے اپنا منصُوبہ آگے بڑھانے کا ایک اور موقع تھا۔ ریاست زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ گیا۔ چوہدری نے اُس کے گھر کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ اُس نے ریاست کی ہمدردیاں جیتنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنوایا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ اگلے چند دن میں میرے لگائے ہوئے تقریباً تمام اندازے درست ثابت ہوئے۔

میری توقع کے عین مطابق صرف دو روز بعد یہ خبر اُڑی کہ چوہدری قاسم ریاست

کی بہن سے شادی کر رہا ہے۔ میرے خیالات کی بہرطور تصدیق ہو گئی تھی۔ میں نے داتی بھاگاں سے ایک دفعہ پھر کام لیا۔ اُس نے اگلے روز مجھے ریاست کے گھر کی مفصل رپورٹ بہم پہنچا دی۔ اُس نے بتایا کہ چوہدری قاسم نے ریاست کو قرضے کے بوجھ تلے اتنا دبا لیا ہے کہ وہ انکار کر ہی نہیں سکتا۔ اُس کی ماں اس بے جوڑ رشتے پر بالکل تیار نہیں۔ لیکن بیٹے کے سامنے اُس کا کوئی بس نہیں چلتا اور اب تو شادو بھی اس شادی پر رضامند ہو گئی ہے۔ اُس نے اپنے بھائی کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیا ہے۔ میرے ذہن میں ایک لمحے کے لئے شادو کا خیال آیا اور پھر چوہدری قاسم کے قہقہے لگاتی ہوئی توند نگاہوں میں گھوم گئی۔ یہ سراسر زیادتی تھی۔۔۔ ایک معصوم پھول کو سازش کی انگلیاں سے کچلا جا رہا تھا۔ قانون کا محافظ ہونے کے ناطے میرا فرض تھا کہ اس لاقانونیت کو روکنے کی کوشش کروں۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ ظلم نہیں ہونے دوں گا۔ اُس دن سے میں نے اپنے تمام ذرائع چوہدری قاسم کے خلاف شہادت ڈھونڈنے میں لگا دیئے۔ دوسری طرف میں ریاست سے ملا اور اُسے ڈھکے چھپے لفظوں میں بتایا کہ شادی کی تاریخ طے کرنے میں جلدی نہ کرے۔ میں کچھ تحقیقات کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے بڑا مسئلہ مُراد کا تھا۔ اُس کے مفرور ہونے کی وجہ سے حالات اُس کے خلاف ہو گئے تھے۔ اگر وہ بے قصور تھا تو اُسے فوراً تھانے حاضر ہو جانا چاہیئے تھا۔ چوہدری قاسم نے اُسے اتنا نقصان نہیں پہنچایا تھا جتنا اُس کی روپوشی اُسے پہنچا رہی تھی۔ میں چوہدری قاسم کے خلاف تحقیقات کے سلسلے میں بڑا پُر اُمید تھا۔ لیکن تین ہفتے کی مسلسل کوشش کے بعد مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ یا تو چوہدری قاسم ایک نہایت ہوشیار اور گھاگ مجرم ہے۔ ایسا مجرم جو اپنے جرم کا کوئی نشان باقی نہیں چھوڑتا یا پھر

بے قصور ہے۔ چوہدری کو اپنے خلاف ہونے والی درپردہ تحقیقات کا علم ہو چکا ا لیکن وہ ایک بار بھی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ ہاں طاقت کے مظاہرے کے لئے نے اپنی حویلی میں ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ جس میں پولیس کے کئی افسر بھی تھے۔ اُس نے مجھے بھی بلایا تھا لیکن میں نہیں گیا۔ ریاست ہسپتال سے فارغ ہو کر آ گیا تھا۔ اور آتے ساتھ ہی اُس نے شادی کی تاریخ مقرر کر دی تھی۔ شادی کی ہاں زور شور سے تیاری تھیں۔ ریاست کا مکان میرے پچھواڑے کی گلی میں تھا۔ رات کو ڈھولک کی آواز اور لڑکیوں کے گیت میرے گھر کی چھت پر بآسانی جاتے تھے۔ جب بھی لڑکیوں کے گیت سُنائی دیتے۔ میرے ذہن میں دو خاموش ں گھومنے لگتیں۔۔۔۔ سوتی سوتی آدھ کھلی آنکھیں میں ان آنکھوں کو پہچانتا تھا۔ نوجوان کی آنکھیں تھیں۔ جسے میں نے سات روزہ ریمانڈ کے دوران بے دردی سے ا تھا۔ لیکن اس کے ہونٹوں سے ایک کراہ بلند نہیں ہوئی تھی۔ ان آنکھوں میں کوئی بات میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ریاست کی شادی ایک عیاش اور کینہ پرور شخص سے ہو گئی تو اُس کا قصوروار میں ہوں گا۔ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ شخص مجرم ہے لیکن میں اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ ی میں ایسے کٹھن مرحلے بہت کم آئے تھے۔ میرا واسطہ ایک ایسے با اثر مجرم سے ں نے ایک لحاظ سے مجھے کھلے میدان میں چیلنج کر دیا تھا کہ میرے خلاف گواہی ڈھونڈ ڈھونڈ لو۔ تین ہفتے میں میں نے بہت ٹکریں ماریں تھیں۔ لیکن کوئی زبان نہیں ۔۔۔۔ کوئی ہاتھ بلند نہیں ہوا تھا۔

ادی سے ایک روز پہلے قاسم سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ رام پورے کے

سُنار سے کچھ زیور لینے کے لئے آیا ہوا تھا سجے سجلئے تانگے پر سوار وہ تھانے کے سامنے سے گزرا۔ کچھ آگے جا کر اُس نے تانگہ روکا اور فخریہ انداز میں چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ اُس کی تمسخرانہ ہنسی پر میرا خُون کھول اُٹھا۔ وہ میرے شانے کو تھپتھپا کر بولا۔

"بادشاہو، غصہ تھوک دو۔ آپ کے گاؤں کا جوائی ہوں، کچھ تو عزت ہونی چاہیئے۔"

سارے کا سارا خُون مجھے اپنے سر کو چڑھتا ہوا محسوس ہوا، لیکن مَیں نے خود پر قابو پالیا۔ جب وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا واپس جا رہا تھا۔ مَیں ایک انتہائی اہم فیصلہ کر چکا تھا۔ پوری زندگی میں مَیں نے صرف چند جذباتی فیصلے کیے ہیں اور یہ اُن میں سے ایک تھا۔ مَیں اپنی کُرسی سے اُٹھا اور اُسے آواز دی، وہ جاتے جاتے رُک گیا۔ مَیں آہستگی سے چلتا ہوا اُس کے پاس پہنچا۔ مَیں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک تیر چلانے جا رہا تھا۔ یہ تیر نشانے پر بھی لگ سکتا تھا اور اُس کے خطا ہونے پر میری پیٹی بھی اُتر سکتی تھی۔ مَیں نے ٹھوس ہوتے لہجے میں کہا۔

"چوہدری:۔ مُراد کو کہاں چُھپا رکھا ہے۔"

اُس کا چہرا سپاٹ رہا لیکن آنکھوں میں لہرانے والا ایک رنگ میری نظروں اوجھل نہ رہ سکا۔

"کیا کہتے ہو بادشاہو! طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"رتّی کے قتل میں تمہارے ساتھ اور کون شریک تھا؟" مَیں نے اُس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

اُسے نے مجھے ایسے دیکھا جیسے پاگل سمجھ رہا ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ قہقہہ

اور اس کی توند ہلنا شروع ہوتی۔ میرا ایک زوردار ہاتھ اُس کے منہ پر پڑا۔ اور اُس کا شملہ اُتر کر دور جا گرا۔ تانگے میں بیٹھے ہوئے مسلح افراد چھلانگیں لگا کر نیچے اُترے۔ اُن کے تیور خطرناک نظر آتے تھے۔ میرے دونوں اے ایس آئی سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی آدمی بندوق سیدھی کرتا وہ انہیں گھیرے میں لے چکے تھے۔ چوہدری نے تہمند کے اندر سے پستول نکالا لیکن میرے پاؤں کی ٹھوکر نے اُسے ہوا میں اچھال دیا۔ ایک اور ٹھوکر کھا کر وہ دوہرا ہو گیا۔ دو سپاہیوں نے اُسے پکڑ لیا۔ وہ مجھے سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔ اب میں حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھا۔

سہ پہر کے وقت چوہدری اپنے گاؤں مہندی پور میں اس طرح داخل ہو رہا تھا کہ اس کی پگڑی گلے میں جھول رہی تھی۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور وہ میرے گھوڑے کے پیچھے پیچھے پیدل چل رہا تھا۔ مہندی پور کے لوگ گھروں سے نکل نکل کر یہ حیرتناک منظر دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اور وہ ڈری ڈری سرگوشیاں کر رہے تھے۔ انہوں نے آج تک چوہدری کو پولیس افسروں کے شانہ بشانہ چلتے اور ایک دسترخوان پر دعوتیں اڑاتے دیکھا تھا۔ وہ اُن کے نزدیک پولیس افسروں سے بڑھ کر قابلِ احترام اور بااختیار تھا۔ پولیس افسر تو روز بدلتے رہتے تھے۔ لیکن چوہدری برسوں سے اُن کا حاکم چلا آ رہا تھا۔ وہ اپنے حاکم کی اس حالت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

مَیں چوہدری کے اثر و رسوخ سے اچھی طرح واقف تھا۔ احتیاطی طور پر مَیں نے نزدیکی تھانے سے بھی پولیس کے کچھ سپاہی منگوائے تھے۔ جب پولیس نے چوہدری کی عالی شان دو منزلہ حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کی تو دروازے پر موجود مسلح آدمیوں نے مزاحمت کی۔ مَیں نے اے ایس آئی گوبندرا اور محمد علی کو اشارہ کیا۔ وہ دس بندرہ سپاہیوں

کے ساتھ چوہدری کے اِن چمچوں پر پل پڑے۔ گاؤں کے چوک میں اِن غنڈوں کی یادگار پٹائی کی گئی۔ یہاں تک کہ وہ مٹی میں لوٹنے اور چیخ و پکار کرنے لگے۔ سپاہی دندناتے ہوئے حویلی کے اندر گھس گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس اور سول حکام میں چوہدری کی بہت دوستیاں ہیں۔ اِس سے پہلے کہ اُس کی گرفتاری کی خبر پھیلتی' مجھے اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت ڈھونڈنا تھا۔ دوسری صورت میں مَیں سخت مشکل میں گرفتار ہو سکتا تھا۔ حویلی کی مکمل تلاشی لی گئی۔ لیکن شراب کی چند بوتلوں اور ایک دو بندوقوں کے سوا کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہ ہو سکی۔ ایک لمحے کے لئے میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ میں ایک بہت بڑا قدم اُٹھا چکا تھا۔ یہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اب کچھ نہ کچھ برآمد ہونا ضروری تھا۔ میں ایک بار خود حویلی میں داخل ہوا۔ تلاشی لی لیکن کوئی مزید چیز برآمد نہ ہو سکی۔ گاؤں کے چوک میں پولیس والے چوہدری کے آدمیوں کو گھیرے کھڑے تھے۔ ایک طرف گوبندر چوہدری کی ہتھکڑی تھامے کھڑا تھا۔ چوہدری کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک بار پھر فاتحانہ چمک لہرانے لگی تھی۔ گاؤں کی آبادی یہاں وہاں ٹولیوں میں کھڑی چپ چاپ تماشا دیکھ رہی تھی۔ مَیں چوہدری کے قریب پہنچا تو وہ چیخ کر بولا۔

"کچھ نہیں ملے گا تھانیدار' کچھ نہیں ملے گا تمہیں۔ تم اپنا کام کر چکے اب میرا کام دیکھنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

"بکواس بند کرو۔" مَیں دھاڑا۔ "تم مجرم ہو اور یہ ثابت ہو کر رہے گا۔" اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی چوہدری قاسم نے اپنا مخصوص قہقہہ لگانے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ مجمعے میں سے ایک بوڑھی عورت تیر کی طرح میری طرف بڑھی۔

میرے قدموں کے پاس آ کر وہ گر گئی اور زور زور سے کچھ بولنے لگی۔ ایک بوڑھا شخص آگے بڑھا اور بدحواسی میں عورت کا منہ بند کرنے لگا۔ عورت بلند آواز میں رو رہی تھی۔ مَیں نے بوڑھے کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ عورت کے پاس جا کر مَیں نے اُسے زمین سے اُٹھایا۔ جذبات کی شدت سے عورت کا سارا وجود کانپ رہا تھا۔ اُس نے اپنا ہڈیوں بھرا کمزور ہاتھ بلند کیا پھر اُس کی استخوانی انگلی چوہدری قاسم کی طرف سیدھی ہوئی۔ اُس نے اپنا سانس اندر کی طرف کھینچا' پھر جیسے صدیوں سے قید آواز ایک چیخ بن کر اُس کے حلق سے آزاد ہوئی۔

"یہ ظالم ہے' یہ درندہ ہے' یہ قاتل ہے۔۔۔۔۔ تھانیدار صاحب' اِسے پھانسی پر لٹکا دو۔۔۔۔۔ اس نے شادی کے روز میری بہو کی عزت لوٹی اور میرے اکلوتے بیٹے کو قتل کر دیا۔"

بُڑھیا کی آواز' گھنگھور گھٹا سے ٹپکنے والا بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی۔ ذرا ہی دیر میں کئی اور فریادی سامنے آئے۔۔۔۔۔ اور پھر لوگ اس شیطان صفت چوہدری کے خلاف نفرت انگیز نعرے بلند کرنے لگے۔ ایک شخص نے بتایا کہ چوہدری نے حویلی کے نیچے ایک بہت بڑا تہہ خانہ بنا رکھا ہے۔ یہ شخص خود پولیس کو تہہ خانے کے خفیہ دروازے تک لے گیا۔ تہہ خانے کے اندر سے چار محبوس افراد برآمد ہوئے۔ یہ چاروں افراد چوہدری کی خود ساختہ جیل میں ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے تھے۔ اِن قیدیوں میں ایک مُراد بھی تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ لیکن اِس کی نیم وا آنکھوں میں خوابوں کی چمک ابھی باقی تھی۔۔۔۔۔ خواب جو اُسے زندہ رکھے ہوئے تھے' خواب جو پیار کرنے والا

چوہدری قاسم کو ڈکیتی قتل اور آبرو ریزی کے کئی مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ اُسے مجموعی طور پر بیس سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ ریاست اور مُراد میں صلح ہوگئی لیکن ایک عرصے تک مُراد کی "مُراد" پوری نہیں ہوئی۔ آخر کوئی ایک سال بعد ریاست کا رویہ نرم ہوا اور اُس نے بہن کا ہاتھ مُراد کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کیا۔

الاؤ انگارے آنچ

مَیں نے میز پہ رکھی ڈاک کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک میلے رنگ کا لفافہ دیکھ کر مَیں چونک اُٹھا۔ مَیں اس لفافے پر گھسیٹے ہوئے الفاظ کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔۔۔۔ مَیں نے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے چھوٹی کاپی کا ایک میلا سا صفحہ برآمد ہوا ٹیڑھے میڑھے حروف میں لکھا تھا۔

"دارو کی بھٹی نالے کے پرلی طرف چلی گئی ہے۔ جامنوں والے باغ میں جمعے کے روز نئے گھڑے نکلنے والے ہیں۔"

حالانکہ تحریر سے مفہوم واضح نہیں ہوتا تھا۔ لیکن مَیں اس کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ بتانے والے نے بتایا تھا کہ اجیت سنگھ نے شراب کی بھٹی ایک نئی جگہ پر چالو کر لی تھی اور جمعے کے روز چھاپہ مارنے سے مجرم رنگے ہاتھوں پکڑے جا سکتے تھے کیونکہ اس روز گھڑے نکال کر شراب کشید کی جانے والی تھی۔۔۔۔ آج جمعے کا دن تھا۔ مَیں نے گھڑی کی طرف دیکھا شام کے چار بجنے والے تھے۔ مَیں نے فوراً اے ایس آئی گوبند سنگھ کو بلایا اور چھاپے کے لئے ہدایات دینے لگا۔

رات بہت تاریک اور سرد تھی۔ ہوا کے جھونکے دھان کے کھیتوں میں سرسراہٹ

پیدا کر رہے تھے۔ یہ سرسراہٹ ہمارے لئے بہت مُفید تھی۔ میرے ساتھ اے ایس آئی گوبندرا اور تین سپاہی کھیتوں کے درمیان جُھک کر چلتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کے بالکل پاس پہنچ چکے تھے۔ مَیں نے نتھنوں کو سکوڑا۔ لاہن کی بُو صاف اپنا پتہ دے رہی تھی۔ ہم تھوڑی دُور اسی طرح جُھکتے ہوئے گئے۔ مَیں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اے ایس آئی اور تینوں سپاہی درختوں کے اِردگرد پھیل گئے۔ مَیں نے پستول نکالا اور باقی سپاہیوں کو لے کر تیزی سے درختوں کے درمیان خالی جگہ کی طرف لپکا۔ وہاں کا منظر ہماری توقع کے عین مطابق تھا۔ چار آدمی شراب کشید کرنے میں مصروف تھے۔ ایک طرف ایک بھٹی میں آگ جل رہی تھی۔ اس پر ایک بڑا سا برتن رکھا تھا۔ کچھ ٹین کے ڈبے اور خالی بوتلیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔

"خبردار" مَیں نے گرجدار آواز میں کہا "کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے"

چاروں آدمیوں کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ پھر اُن میں سے ایک۔ جو درختوں کے بالکل قریب تھا اچانک بھاگ اُٹھا۔ میرے پستول سے شعلہ نکلا۔ گولی اُس کی پنڈلی پر لگی لیکن وہ رُکا نہیں۔ "زمین پر لیٹ جاؤ" مَیں نے ہوا میں فائر کرتے ہوئے باقی تینوں افراد کو دھمکایا۔ وہ جلدی سے لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد اے ایس آئی گوبندرا اور دو سپاہی بھاگنے والے شخص کو گرفت میں لئے درختوں سے نمودار ہوئے۔ مَیں اُسے فوراً پہچان گیا وہ ملکھا سنگھ کا بڑا لڑکا اجیت تھا۔

یہ تیسری دفعہ تھی کہ اجیت سنگھ کی بھٹی پکڑی گئی تھی۔ اس سے پہلے بھی ایسے ہی دو گمنام خطوں پر مَیں نے کامیاب چھاپے مارے تھے۔ اجیت کا باپ ماکھا یہاں کا کھاتا پیتا زمیندار تھا "اٹھراہ" کے گاؤں میں اگر کوئی اس کی برابری کر سکتا تھا تو وہ اُس

کا بڑا بھائی لاکھا سنگھ تھا۔ لاکھا سنگھ اور ماکھا سنگھ اور اُن کی اولاد میں بُرائیاں تو بیشمار تھیں لیکن اُن کی ایک خُوبی نے سب بُرائیوں کو چُھپا لیا تھا اور وہ خُوبی تھی اتفاق کی۔

اُن کے اتفاق کی اِردگرد کے لوگ مثالیں دیتے تھے۔ دونوں نے ساری زندگی نہایت سلوک سے گزاری تھی اور اب اپنی اولادوں کے زمانے میں بھی انہوں نے اس سلوک کو کم نہیں ہونے دیا تھا۔ بڑے بھائی لاکھا سنگھ کے چار بیٹے راجندر، نریندر، سرمندر وغیرہ تھے۔ چھوٹے بھائی ماکھا سنگھ کے تین بیٹے اجیت، رنجیت اور دلجیت تھے۔ ماکھے کے بیٹے کافی تیز طرار تھے اور آئے دِن کہیں نہ کہیں پُھڈا ڈال لیتے تھے۔ بڑے بھائی لاکھے کے بیٹے بھی کچھ کم نہیں تھے لیکن ماکھا سنگھ کے بیٹوں کی نسبت کچھ امن پسند تھے یہ کمی انہوں نے دوسری طرح پُوری کی تھی۔ وہ کمینگی اور عیاری میں چچازاد بھائیوں سے دو ہاتھ آگے تھے۔ لاکھا اور ماکھا کی زمین گاؤں سے باہر کافی دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بظاہر یہ لوگ زمیندارا کرتے تھے لیکن ماکھا کے بیٹے زمیندارے کے علاوہ غیر قانونی چکر بھی چلاتے رہتے تھے۔ جہاں تک مَیں نے مشاہدہ کیا تھا لاکھا اور ماکھا کے کچھ اُصول تھے وہ ایک دوسرے کے عیبوں کو چُھپاتے تھے۔ گھر اور باہر کے تمام فیصلے اکٹھے بیٹھ کر کرتے تھے۔ ایک دفعہ کوئی فیصلہ ہوجانے پر سب لوگ اُس پر ڈٹ جاتے تھے۔ فیصلہ چاہے غلط ہوتا تھا لیکن وہ اتنی مضبوطی سے اُس پر قائم ہوجاتے تھے کہ اُس پر صحیح کا گمان ہونے لگتا تھا۔ لگان کی ہیرا پھیری سے لے کر لڑکیوں کے اغواہ تک اور لڑکیوں کے اغواہ سے لے کر ناجائز بچے ٹھکانے لگانے تک۔ ہر کام وہ کرتے تھے۔ لیکن اس طریقے سے کہ کسی کو اُنگلی اُٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ظاہر ہے ان کے اِردگرد اُن کے مخالفین بھی ہوں گے لیکن اُن کی متفقہ طاقت سے خوف کھاتے ہوئے وہ

سب خون کے گھونٹ پئے بیٹھے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ خطوں والا سلسلہ بھی اُن کے کسی در پردہ دُشمن کا چلایا ہُوا تھا۔ لیکن کچھ بھی تھا یہ شخص کام ٹھیک ٹھاک کر رہا تھا۔ خط پر جودھ پُور قصبے کی مہر ہوتی تھی۔ جو امرتسر جانے والی سڑک پر کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر تھا۔

دوسرے روز مخبر بلال شاہ تھانے آیا۔ اُس نے آتے ساتھ ہی کہا۔

"خاں صاحب! آپ کی پیش گوئی ٹھیک نکلی۔ لاکھا اور ماکھا کے درمیان کچھ اَن بن ہو ہی گئی ہے۔"

مَیں نے اُسے جھڑکا کہ اتنی اُونچی آواز میں اطلاع دینے کی کیا ضرورت تھی۔ بلال شاہ تھا تو بڑے کام کا آدمی لیکن اُس میں دو خامیاں تھیں۔ ایک تو افسر کے ساتھ بے تکلف ہو جاتا تھا۔ دوسرے تھانے میں آتے ہی بغیر سوچے سمجھے اُونچی آواز میں بولنا شروع کر دیتا تھا۔ پچھلے ایک مہینے سے وہ لگاتار یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے چھاپوں کا لاکھا اور ماکھا کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اُس کا کہنا تھا کہ مَیں چالیس سال سے ان لوگوں کے درمیان رہ رہا ہوں۔ ان لوگوں کے تعلقات آپس میں خراب ہو ہی نہیں سکتے۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ اُن کے تعلقات پر ان واقعات کا ضرور اثر پڑے گا۔ میرے خیال کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ یہ لوگ ہر کام اتفاق رائے سے کرتے تھے۔ اگرچہ لاکھا کے لڑکے شراب کشید کرنے کے چکّر میں نہیں تھے لیکن انہیں علم تو سارا ہو گا کہ شراب کی بھٹی کہاں منتقل کی جا رہی ہے۔ شراب کب نکلے گی وغیرہ وغیرہ۔ یہ لوگ ہر کام نہایت راز داری سے کرنے کے عادی تھے۔ غیر قانونی کاموں کے لئے اپنے اعتماد ترین کارندے کو استعمال کرتے تھے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وہ ہر بار پکڑے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے

مُوم پھر کر دھیان لاکھا کے لڑکوں کی طرف جاتا تھا۔ پچھلے دو چھاپوں کے بعد لڑکوں ں یقیناً اَن بن ہوتی ہو گی لیکن لاکھا اور ماکھا نے معاملے کو سمیٹ لیا ہو گا لیکن سرے کامیاب چھاپے کے بعد آگ میں سے دھواں نکلنا لازمی تھا۔ لگتا تھا عروج ے بعد اب اس خاندان پر زوال کے دِن آ گئے تھے۔ لڑکوں میں جھگڑا ہُوا تھا۔ ین اُس کی نوعیت اور شدّت کا علم بلال شاہ کو نہیں تھا۔ بہر حال دوسرے دِن ے اس بارے میں ایک دوسرے مخبر سے پتہ چل گیا۔ اُس نے بتایا کہ لاکھا سنگھ کے یکے نریندر اور ماکھا سنگھ کے لڑکے رنجیت کے سَروں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ ایہ اُن کا کسی سے جھگڑا ہُوا ہے لیکن مَیں اس معاملے کو سمجھتا تھا۔ کل یقیناً وہ لوگ آپس میں لڑے تھے لیکن دونوں جہاندیدہ بوڑھوں نے عقلمندی سے اپنے اپنے لڑکوں کو ایک بار پھر صلح پر مجبور کر دیا تھا۔

چند روز بعد ایک اور پیلا لفافہ آ گیا۔ اب کی بار اُس میں ایک نہایت اہم اطلاع تی لیکن اس دفعہ اطلاع بڑے بھائی لاکھا سنگھ کے متعلق تھی۔ ماجھے کا ایک بدنام ڈاکو جو پہلے دنوں پولیس کی حراست سے فرار ہو گیا تھا لاکھا سنگھ کے گھر چھپا ہُوا تھا۔ مَیں نے لاہور میں متعلقہ تھانے کو اطلاع دی۔ اگلے روز ہم نے پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ لاکھا سنگھ کے مکان پر چھاپہ مارا۔ یہ ایک بہت بڑا مکان تھا اور ارد گرد کے علاقے میں ی حویلی کے نام سے مشہور تھا۔ حویلی کے ایک حصّے میں لاکھا اور دوسرے میں ماکھا رہتا تھا۔ تا ہُوا کہ لاکھا اس وقت حویلی میں موجود نہیں تھا اور نہ خون خرابے کے بغیر مفرور کا ہاتھ انا ممکن نہیں تھا۔ مفرور کا نام جبرُو تھا۔ اُس نے جب چاروں طرف پولیس کی گارد دیکھی ہتھیار پھینک کر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ لاکھا سنگھ اُس وقت امرتسر میں تھا۔

اُس نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے وہیں سے ضمانت قبل از گرفتاری کروالی۔

قتل

صبح کا وقت تھا مَیں دُھوپ میں بیٹھا ایک حوالاتیے سے کمر کی مالش کروا رہا تھا کہ بلال شاہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر داخل ہوا۔

"خاں صاحب! پیلے لفافوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ کوئی اور ۔ ۔ ۔ ۔ " میرے منہ سے ایک موٹی سی گالی نکل گئی۔

اُس نے چونک کر حوالاتیے کی طرف دیکھا اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ میں نے حوالاتیے کو اُٹھا دیا۔ اتنے میں اے ایس آئی گوبندر بھی آگیا۔ بلال شاہ نے پھر وہیں سے رابطہ جوڑا۔

"خان صاحب پیلے لفافوں نے کمال ہی کر دیا۔"

مَیں نے اُسے جھاڑتے ہوئے کہا۔ اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھو، مجھے خون خرابے کی بُو آرہی ہے۔ کئی بار آدمی کا کہا اتنی جلدی سچ ثابت ہوتا ہے کہ خود اُسے حیرانی ہونے لگتی ہے۔ ابھی بلال شاہ نے میری بات کے جواب میں کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازہ ایک دھماکے سے کُھلا۔ گاؤں کا پٹواری اندر داخل ہوا۔

"خاں صاحب! پکّی حویلی میں قتل ہو گیا۔ رات کسی نے لاکھا کے بیٹے نریندر کو مار دیا۔"

گوبندر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ مَیں نے اُسے فوراً حویلی پہنچنے کا حکم دیا۔ وہ سیلوٹ مار کر سپاہیوں کی طرف چلا گیا۔ مَیں وردی پہن کر قریباً دس منٹ بعد حویلی پہنچا۔

لاکھا سنگھ دروازے پر ہی مل گیا۔ وہ اپنے سفید ننگے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر رو رہا تھا

ا کی پگڑی گلے میں جھول رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ صبح جب نریندر دیر تک نہیں اُٹھا اُس کی بھابھی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ چارپائی سے نیچے گرا پڑا تھا۔ کسی نے تیز دھار ہری سے اس کا گلا کاٹ دیا تھا۔ وہ پھر رونے لگا۔ مَیں موقع واردات پر پہنچا۔ کمرے ا جد وجہد کے آثار نہیں تھے۔ مقتول شاید تڑپنے کی وجہ سے نیچے گر گیا تھا۔ مَیں نے ان کے قریب جا کر زخم کا معائنہ کیا۔ گھاؤ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ لیکن نرخرہ کٹ چکا تھا۔ ے کی کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ صرف ایک دروازہ تھا۔ ساتھ والے کمرے سے اُونچی ا از میں عورتوں کے بین سنائی دے رہے تھے۔ مَیں نے مقتول کی بھابی کو بُلا کر اُس ے چند سوال کئے۔ وہ بیس بائیس سال کی ایک عام سی گھریلو عورت تھی۔ اُس نے بتایا ا دھوپ چڑھے مَیں نے دیر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ ا خون میں لت پت فرش پر پڑا تھا۔ مَیں نے اُس سے چند سوال اور کئے۔ پھر مَیں نے اے ایس آئی گوبندر کو موقعۂ واردات کا نقشہ تیار کرنے کا حکم دیا اور بیٹھک میں آکر گیا۔ قریباً دو گھنٹے میں ماکھا سنگھ اس کے لڑکوں اور رات پہرہ دینے والے چوکیداروں سے والات کرتا رہا۔ ماکھا سنگھ اور اُس کے لڑکے کسی حد تک خاموش اور افسردہ دکھائی تھے۔ مَیں ماحول میں عجیب طرح کی کشیدگی محسوس کر رہا تھا۔ سب لوگ خاموش تھے لن جیسے اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ فیصلے ہو رہے تھے۔ آخر نے لاکھا سنگھ سے سوال کیا کہ وہ ابتدائی رپورٹ میں کس کا نام لکھوانا چاہتا ہے۔ لاکھا سنگھ آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ اُس نے کُرسی آگے کو کھسکاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"لکھو جناب! ماکھا سنگھ ۔ ۔ ۔ ۔ اجیت سنگھ، رنجیت سنگھ" کمرے میں کوئی چیز ے چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ ہر چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آنے لگے۔ رنجیت سنگھ

چیخا۔ "تایا ہوش میں تو ہو" لاکھا سنگھ کا چہرہ خوفناک ہو رہا تھا۔ وہ دانت پیس کر غرّایا "حرامزادو میں تمہاری بوٹیاں کر دوں گا۔ اُس نے تین چار زور دار تھپڑ اس کے منہ پر مارے۔ اتنے میں مقتول کا بڑا بھائی راجندر کرپان تان کر اس پہ جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ خون خرابہ ہو جاتا میں نے اے ایس آئی اور سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر مشتعل افراد کو گرفت میں لے لیا۔ ماکھا سنگھ بڑے بھائی سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "بھا تیا! تُو نے ہم پر شک کیا ہے۔ تُو نے باپ کی قبر کی مٹی اُڑائی ہے۔" لاکھا سنگھ کا بڑا بیٹا راجندر سپاہیوں کی گرفت میں تڑپ تڑپ جا رہا تھا۔ کرپان ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر کرپان اُس کے ہاتھ سے چھین لی۔

مُخبر کی تلاش

لاکھا اور ماکھا کی لڑائی اور پھر اُن کی علیحدگی گاؤں کی تاریخ کے اہم واقعات تھے۔ دونوں بھائیوں میں بٹوارا ہو گیا۔ اور دونوں گھروں کے افراد ایک دُوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ماکھا سنگھ اپنے بھائی سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوا۔ اور اُس نے حویلی سمیت بہت سی نقد رقم اپنے حصے میں ڈلوا لی۔ قرضوں کا زیادہ بوجھ بھی لاکھا سنگھ کو ہی اُٹھانا پڑا اور اوپر سے مقدمے بازی۔ نریندر عرف نکھن کی موت نے اس کی کمر توڑ دی تھی وہ اس کا سب سے ہوشیار لڑکا تھا۔ پیداوار بھی گھٹ گئی۔ مخالف اٹھانے لگے اور لکھا سنگھ کی حالت پتلی ہونے لگی لیکن اُس کی "دم اکڑ" میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کا بیٹا راجندر لوگوں سے کہتا پھرتا تھا کہ میں نے ماکھا سنگھ کی طرفداری کی ہے اور اُس کے بیٹوں کو جان بوجھ کر قتل میں ملوث نہیں کیا حالانکہ "اٹھراہ" گاؤں کے لوگ

جانتے تھے کہ ماکھے کی نسبت لاکھے سے میری سلام دُعا زیادہ تھی۔

مجھے ان باتوں کی پرواہ نہیں تھی۔ میں صرف قانونی تقاضے پُورے کرنا چاہتا تھا۔ گواہیوں اور شواہد سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ ماکھا یا اُس کے بیٹے قتل میں شریک نہیں تھے۔ ماکھا اور اس کا بڑا بیٹا شہر تاریخ بھگتنے گئے ہوئے تھے جبکہ دونوں چھوٹے بیٹے رنجیت اور دلجیت قتل ہونے کے دو گھنٹے بعد تک ایک شادی والے گھر میں موجود تھے۔ وہاں "کنجری کا ناچ" ہو رہا تھا جو رات دو بجے ختم ہوا۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق قتل گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان ہوا تھا۔ وقتی طور پر صرف ایک گواہی نے مجھے شک میں ڈالا۔ یہ گواہی مقتول کی بھابی پریتم کی تھی۔ اُس نے تفتیش کے دوران بتایا تھا کہ قتل والی رات شام مقتول اور اس کے چچا زاد رنجیت کے درمیان پھر کسی بات پر تُو تُو میں میں ہوئی تھی۔ بہرحال گاؤں کے کئی معتبر آدمیوں کی گواہیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ تمام گواہیاں بتاتی تھیں کہ رنجیت اور دلجیت رات ڈھائی بجے تک شادی والے گھر میں موجود تھے۔

یوں تو لاکھا سنگھ کے کئی مخالف تھے لیکن خاص طور پر کسی پر بھی شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نریندر عرف نکھن کا قتل بدستور معمہ بنا ہوا تھا۔ میرا دھیان بار بار گمنام خطوں کی طرف جاتا تھا۔ لاکھا اور ماکھا دونوں نہیں جانتے تھے لیکن مجھے معلوم تھا کہ ان کا کوئی مشترکہ دشمن ان کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ گمنام خط لکھنے والے نے لاکھا اور ماکھا دونوں کی مخبری کی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ ان دونوں پارٹیوں میں سے نہیں تھا۔ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے تین اندازے قائم کئے جا سکتے تھے۔ نمبر ایک یہ کہ قتل اسی مخبر نے کیا ہے۔ نمبر دو مخبر کی خواہش کے عین مطابق ماکھا سنگھ کے بیٹوں نے مشتعل ہو کر قتل کیا ہے۔ نمبر تین یہ لاکھا یا ماکھا سنگھ کے کسی اور مخالف

کا کام ہے۔ اگر میں نے صرف کارروائی ڈالنا ہوتی تو مشکوک افراد میں سے چند کو گرفتار کر کے چالان مکمل کر سکتا تھا لیکن میں حقیقی قاتل کا سراغ لگانا چاہتا تھا۔ تقریباً دو ماہ کی اعصاب شکن دوڑ دھوپ کے بعد یہ بات سامنے آئی تھی کہ اوپر قائم کئے گئے آخری دونوں اندازے درست نہیں تھے۔ اب صرف پہلے اندازے کی حقیقت کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا۔ اس اندازے کے مطابق گمنام مخبر خود اس قتل کا ذمے دار تھا۔

خطوں سے یہ بات ظاہر تھی کہ گمنام مخبر لاکھا اور ماکھا کا کوئی نہایت قریبی شخص تھا۔ یہ بھی بعید از امکان نہیں تھا کہ وہ اکثر و بیشتر اُن کے گھر آتا جاتا رہتا ہو۔ اُس نے کئی ایسی اطلاعات دی تھیں۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف اُن کا کوئی قریبی ساتھی ہے بلکہ صبح و شام اُن کی ٹوہ میں رہتا ہے۔ پکّی حویلی میں بٹوارے سے پہلے لاکھا اور ماکھا اپنے اپنے اہل خانہ کے ساتھ دو علیحدہ حصوں میں رہتے تھے۔ لاکھا والے حصے میں کل سات افراد رہتے تھے۔ ان میں لاکھا اس کی بیوی ایک بہو اور چار بیٹے شامل تھے۔ چھوٹے بھائی ماکھا والے حصے میں چھ افراد رہتے تھے یعنی ماکھا اس کی بیوی تین بیٹے اور ایک نوکرانی۔ تمام حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے پکّی حویلی کے ان تیرہ افراد میں سے صرف نوکرانی پر شک کیا جا سکتا تھا۔ نوکرانی جس کا نام چھیموں تھا۔ پچیس چھبیس سال کی ایک میلی کچیلی لیکن خوبصورت عورت تھی۔ میں پوچھ گچھ کے لئے اُس سے ایک بار مل چکا تھا۔ پھٹے پُرانے کپڑوں کے نیچے اُس کا بھرپُور جسم کسی کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس کے چہرے میں اس کے سفید دانت سب سے زیادہ خوبصورت تھے۔ وہ دو بچّوں کی ماں تھی۔ بڑا بچّہ کوئی بارہ سال کا تھا۔ اس کا خاوند راج گیری کرتا تھا۔ مجھے خبر تھی کہ کنوارے مردوں کے گھر میں ایک جوان خوبصورت عورت کی موجودگی کئی کہانیاں جنم دیتی ہے۔ ایسی ہی کسی کہانی کی ٹوہ کے لئے میں نے گاؤں کی دائی "بھاگاں" سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔

بھاگاں پہلے بھی میرے ایک دو کام کر چکی تھی۔ میں نے اس سے نوکرانی چھیموں کا ذکر کیا تو اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پہلے ہی سے چھیموں کے بارے کافی کچھ جانتی ہے۔ میرے پوچھنے پر اُس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ اُس نے بتایا کہ مقتول نریندر نے نوکرانی چھیموں سے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ وہ اکثر اپنے چچا کے گھر میں گھسا چھیموں سے آنکھ مٹکا لڑاتا رہتا تھا۔ چھیموں کا خاوند کام کے سلسلے میں دنوں سے باہر رہتا تھا اور مہینے میں دو تین بار ہی گھر کے چکر لگاتا تھا۔ یہ معلومات میرے لئے نہایت سُود مند تھیں۔ آگے بڑھنے کی ایک راہ پیدا ہو گئی تھی۔

نوکرانی مشکوک تھی

دائی بھاگاں نے واقعہ اپنے انداز میں بیان کیا تھا لیکن اس کے کئی پہلو ہو سکتے تھے۔ یہ بھی بہت ممکن تھا کہ نریندر کی دست درازیوں کا شکار ہونے والی دو بچّوں کی ماں چھیموں نے انتقام لینے کا فیصلہ کیا ہو۔ اس نے موقعہ پا کر اپنی عزّت کے قاتل کو ختم کر دیا ہو۔ دیکھا گیا ہے کہ باحیثیت گھرانوں کے ملازمین اپنے پر ہونے والی زیادتیوں کو بعض اوقات ایک سرد انتقامی جذبے کی صُورت دے دیتے ہیں اور موقع ملتے ہی "گھر کا بھیدی" لنکا ڈھا دیتا ہے۔ ہو سکتا تھا یہ بھی کوئی اسی قسم کا معاملہ ہو۔ میں نے اگلے روز پھر نوکرانی چھیموں سے پُوچھ گچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی میں وردی پہن کر "پکّی حویلی" جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مقتول کا چھوٹا بھائی سریندر تھانے میں داخل ہوا۔ اُس کی عمر کوئی بائیس سال رہی ہو گی۔ گول سُرخ چہرے اور اچھے ڈیل ڈال والا تھا لیکن اُس وقت اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ سخت پریشان دکھائی دیتا

تھا۔ سلام کا جواب دے کر مَیں نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کیا بات ہے باؤ؟ کسی سے لڑ جھگڑ کر تو نہیں آئے" مَیں نے اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے کہا۔

"نہیں خاں صاحب" اُس نے سر کھجاتے ہوئے کہا "دراصل مجھے بڑا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔"

مَیں نے اسے کہا کہ مَیں کہیں جا رہا تھا میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اُس نے جو کچھ کہنا ہے کھُل کر کہے۔ وہ کھنکار کر بولا۔ "یا تو آپ چاچے ماکھے کے پُتروں کو سنبھال لیں یا پھر یہاں خون خرابہ ہو گا۔"

"کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟" مَیں نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

اس نے کہا "جناب کوئی رات ہمارے گھر میں پھرتا رہا ہے میں اُوپر چوبارے میں سوتا ہوں۔ پہلے کوئی کھڑکی ہلاتا رہا۔ کھڑکی اندر سے بند تھی۔ پھر کچھ آدمی کمرے کی چھت پر گھومتے رہے۔ بدقسمتی سے میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ مَیں نے اُن سے اُلجھنا مناسب نہ سمجھا۔ اس سے پہلے پرسوں رات بھی اس قسم کی آوازیں آئی تھیں۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔"

مَیں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن خوف اُس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ مَیں نے اُسے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"جوان ہو، کوئی چوہے تو نہیں ہو۔ اتنا گھبرا کیوں رہے ہو۔ حوصلہ رکھو۔"

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد مَیں نے حویلی کا رُخ

کیا۔ ماکھا سنگھ گھر پر ہی تھا۔ مَیں نے اس کے ذریعے چھیموں کو بلوایا۔ خاص طور سے بلوائے جانے پر وہ بڑی خوف زدہ دکھائی دیتی تھی۔ پہلی ملاقات میں اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ قتل کی رات حویلی ہی میں تھی۔ کام زیادہ ہونے پر وہ حویلی ہی میں سو رہتی تھی۔ اس کے بچّوں کو اس کی ساس اور نندیں سنبھالتی تھیں۔ اس دفعہ مَیں نے اُس سے نریندر کے حوالے سے کچھ سوال کئے۔ وہ کافی خوف زدہ دکھائی دیتی تھی۔ حسبِ توقع س نے کہا کہ وہ اسے دیور سمجھتی تھی۔ لیکن مَیں نے یہ سوال نہیں کیا کہ وہ اسے کیا سمجھتا تھا۔ س سوال کا جواب اس کی جھکی ہوئی آنکھیں اور کانپتے ہوئے ہونٹ دے رہے تھے کوشش کے باوجود پون گھنٹہ کی گفتگو میں اس سے کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ ادیب لوگ ںندر سے زیادہ گہری عورتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ بھی اُن ہی میں سے ایک تھی "پکّی حویلی" ے مَیں سیدھا لاکھا سنگھ کے مکان پر گیا۔ یہ مکان اس نے نیا بنوایا تھا۔ یہ بھی ایک کافی ڑا مکان تھا۔ اس کی دو منزلیں تھیں اور وقت کے مطابق اس کو نئے فیشن کا مکان ہا جا سکتا تھا۔ لاکھا سنگھ خود ڈیرے پر گیا ہوا تھا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا بیٹا اجندر گھر پر ہی تھا۔ مَیں نے اس کی بیوی یعنی مقتول کی بھابھی کو بلوایا۔ اس نے سب سے پہلے مقتول کی لاش دیکھی تھی۔ بھابھیاں اپنے دیوروں کے بارے میں بہت سی لومات رکھتی ہیں۔ مَیں نے اس سے چھیموں اور نریندر کے تعلقات کے بارے ید کرید کر کچھ سوال پوچھے۔ پہلے تو وہ جھجکتی رہی۔ پھر بتدریج میرے سوالوں کے اب دینے لگی۔ وہ ایک ذہین عورت تھی اور لگتا تھا کہ میری تفتیش کے رُخ کو سمجھ ی ہے۔ اُس نے ایک نہایت کام کی بات یہ بتائی کہ قتل سے چند روز پہلے چھیموں اس کے خاوند نے بُری طرح

اُس کی باتوں سے میرے اس خیال کی بھی تصدیق ہوئی کہ چھیموں سے نریندر کے تعلقات بہت حد تک یک طرفہ تھے۔ بقول اس کی بھابی کے اُس چڑیل نے اُس کے دیور کی عقل مار دی تھی"۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر میں واپس تھانے آگیا۔ آگے لاکھا سنگھ بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں تو خود اُس کے گھر گیا ہوا تھا۔ میں نے اُسے اب تک کی تفتیش کے بارے میں بتانا مناسب سمجھا وہ اپنی جھکی ہوئی بڑی بڑی سفید مونچھوں کو بل دیتے ہوئے سنتا رہا۔

میں نے اُسے گمنام خطوں سے لے کر اُس کی بہو پریتم سے ملاقات تک کے تمام چیدہ چیدہ واقعات بتائے۔ میں نے کہا۔

"چوہدری لاکھے میں اسی لئے کہتا تھا کہ یہ قتل کسی ایسے شخص کا کام ہے جو تم دونوں بھائیوں کا دشمن ہے"۔ گاؤں کے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جو بات ایک بار اُن کے ذہن میں بیٹھ جائے پھر نکالے نہیں نکلتی۔ لاکھے کے ذہن میں بھی یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ ماکھا اُس کا دشمن ہے اور یہ قتل اُس نے یا اس کے بیٹوں نے کیا ہے۔ میری تمام باتیں سننے کے بعد بھی اُس نے وہی رٹ شروع کر دی۔ اُس نے کہا "خاں صاحب اگر آپ کی تفتیش کے مطابق ماکھے کی نوکرانی چھیموں کا اس قتل میں ہاتھ ہے تو بھی یہ ماکھے ہی کا کام ہے۔ اصل کھیل اسی کا ہے اور اُسی نے کھیلا ہے۔ میں کوئی اور بات مان ہی نہیں سکتا"۔ میں نے ہٹ دھرمی کے اس پتھر سے اور سر پھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور خشک لہجے میں پوچھا کہ وہ کس کام کے لئے تھانے آیا ہے۔ اس نے بھی وہی بات دُہرانی شروع کی جو صبح اس کا بیٹا کر گیا تھا۔ لاکھے کا کہنا تھا کہ اس کا بیٹا بہت بپھرا ہوا ہے کوئی خون خرابہ ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ گھر کے باہر ایک دو سپاہی لگا دیئے جائیں۔ صبح میں اُس کے بیٹے کا "بپھرا پن" اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ موت کے خوف سے بیچارے کی صورت بگڑی ہوئی تھی۔ بہر حال میں نے رات کے وقت دو سپاہی بھیجنے کا وعدہ کر لیا۔

ایک اور خط

نوکرانی چھیموں مشکوک ہو چکی تھی اور میں اپنے مخبروں بلال شاہ اور دائی بھاگاں کے ذریعے اس کے بارے میں تیزی سے معلومات حاصل کر رہا تھا لیکن سوچنے کی بات تھی کہ جیسا کہ یہ ثابت ہو گیا تھا۔ قتل صرف ایک آدمی کا کام ہے"، تو کیا چھیموں اکیلی یہ کام کر سکتی تھی..... لیکن دوسرے دن ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے حالات کا رُخ ایک بار پھر موڑ دیا..... لاکھا سنگھ کے نئے مکان میں اُس کا دُوسرا بیٹا سریندر قتل ہو گیا۔ اس قتل سے پورے علاقے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ سریندر سنگھ اپنے مکان کی دوسری منزل میں بند کمرے میں سویا ہوا تھا۔ مکان کے باہر دو پولیس والے پہرہ دے رہے تھے لیکن قاتل اپنا کام کر گیا۔ جس کمرے میں قتل ہوا اس کی دو کھڑکیاں تھیں اس کے علاوہ لکڑی کے موٹے تختوں کا انگریزی دروازہ تھا۔ جو اندر سے دو چٹخنیاں لگا کر بند کیا گیا تھا۔ ایک کھڑکی دروازے کے ساتھ تھی وہ بھی اندر سے بند تھی۔

دوسری کھڑکی کمرے کے پچھواڑے میں تھی۔ یہ کھڑکی زمین سے کوئی بیس فٹ بلند تھی۔ ٹین کا پرنالہ کھڑکی کے پاس سے گزرتا تھا۔ کسی آدمی کا اس پرنالے کے ذریعے اوپر چڑھنا جان جوکھوں کا کام تھا لیکن قاتل نے یہ کام کر دکھایا تھا اور اُس کھڑکی سے کمرے کے اندر کود کر سریندر کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ لاش [illegible]

پڑی تھی جیسے پہلی واردات کے موقع پر تھی۔ مقتول کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں کمیس کھلے تھے۔ اور گلا کسی تیز دھار آلے سے کٹا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں ہی میں نے محسوس کر لیا کہ نریندر اور سریندر کا قاتل ایک ہی ہے۔

قتل کی پہلی واردات نسبتاً آسان تھی لیکن دوسری واردات میں قاتل نہ صرف یہ کہ پولیس کے مسلح آدمیوں کو چکمہ دے کر گھر میں داخل ہوا تھا بلکہ ایک نہایت مشکل راستے سے مقتول کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ ظاہر تھا یہ کسی عورت کا کام نہیں۔ قتل کے فوراً بعد میں نے ماکھا اور اس کے بیٹوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ خون خرابے سے بچنے کے لئے یہ نہایت ضروری تھا۔ ایک ماہ کے اندر اندر ایک ہی گھر کا یہ دوسرا فرد قتل ہو گیا تھا اور قاتل کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ میں اپنے کندھوں پر زبردست بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ میرا عملہ چاروں طرف بھاگ دوڑ میں مصروف تھا اور میں اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتیں قاتل تک پہنچنے کے لئے صرف کر رہا تھا۔ یہ ایک عام ڈگر سے ہٹا ہوا کیس تھا اور اس کے لئے مجھے قدرے مختلف انداز سے سوچنا پڑ رہا تھا۔ اُس وقت میں تھانے میں مقتولین کے باپ چوہدری ماکھے سے گفتگو کر رہا تھا کہ اے ایس آئی گوبندر کچھ کاغذات لئے اندر داخل ہوا۔ میں اُس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر دیکھنے لگا۔ اس پر گاؤں اور ارد گرد کے قریباً تیس افراد کی تحریروں کے نمونے تھے۔ یہی وہ افراد تھے جو اس سارے علاقے میں کچھ لفظ لکھ سکتے تھے۔ ان میں سے کوئی تحریر بھی گمنام خطوں کی تحریر سے میل نہیں کھاتی تھی۔ آخر وہ کون شخص تھا جو گمنام خط لکھتا تھا۔ کون تھا وہ؟

اتنے میں دُور سے بلال شاہ کی آواز سنائی دی۔ وہ حسبِ معمول بلند آواز میں بولتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ اس وقت وہ لاکھا سنگھ کی شان میں قصیدے کہہ رہا

تھا اور لاکھا سنگھ میرے پاس بیٹھا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تجھے خدا سمجھے چوہدری، سارے تھانے کی نیندیں حرام کر دی ہیں تُو نے اور تیرے پتروں نے۔ جتے کوئی اور بھگتے کوئی۔ ٹانگیں ٹوٹ گئیں میری تو۔"

کمرے میں پہنچ کر اس نے لاکھا سنگھ کو میرے پاس بیٹھے دیکھا تو وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکا۔ بات بدلنا بلال شاہ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بغیر رُکے بولتا چلا گیا۔

"خدا غارت کرے ایسے پُتروں کو اور ایسے پُتر جمنے والے باپ کو، میرے بس میں ہوتا تو ایک رات میں پھاہے لگا دیتا چاروں باپ بیٹوں کو۔"

لاکھے کی باتیں اُس نے کمال صفائی سے ماکھے کے کھاتے میں ڈال دی تھیں۔ مجھے یقین ہے اگر اُس نے لاکھے کا نام لے کر بھی اُسے کوسا ہوتا تو بھی کوئی بات بنا لیتا۔ خیر...... میں نے اُسے گھور کر دیکھا اور کہا کہ کام کی بات کر جس کام کے لئے تمہیں بھیجا تھا اُس کا کیا بنا؟ اُس نے پہلے ایک بار پھر اپنی ٹانگوں کا رونا رویا پھر بتایا کہ ساری بھاگ دوڑ بیکار گئی۔ "بلاّ"، تو تین چار دن سے گاؤں ہی میں موجود تھا۔ میں نے دراصل اُسے چھیموں کے خاوند بلّے کی کھوج میں امرتسر بھیجا تھا۔ وہاں اُس کے ٹھکانے سے بلال شاہ کو یہ پتہ چلا تھا کہ بلّا تو گاؤں گیا ہوا ہے۔ اس کا مطلب تھا قتل کی رات بلّا گاؤں ہی میں موجود تھا۔ یہ بات اُسے اور بھی مشکوک کرتی تھی۔ میں نے اس رُخ پر سوچنا شروع کیا۔

بیوی کے چال چلن پر بلّے کو شبہ تھا۔ اُس نے بیوی کو مارا بھی تھا۔ یہ سلسلہ کافی دیر سے چل رہا تھا لیکن بلّا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ آخر اُس نے درپردہ انتقام کا راستہ

اختیار کیا اور اپنے خطوں کے ذریعے پہلے دونوں خاندانوں میں پھوٹ ڈلوائی اور پھر لاکھا سنگھ کے بیٹوں کو قتل کر دیا۔ لیکن بچّی حویلی کے اندر کی باتیں اُسے کیسے معلوم ہوتیں —— ہاں یہ ہوسکتا تھا کہ یہ دونوں میاں بیوی کا مشترکہ منصوبہ ہو۔ خطوں کا مسئلہ بھی حل ہوجاتا تھا۔ بلاّ چونکہ کام کے سلسلے میں گاؤں سے باہر رہتا تھا اس لئے خط لکھ کر یا کسی سے لکھوا کر ڈاک سے بھیجتا رہتا تھا ——

میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ چودھری لاکھا اور بلال شاہ سامنے کرسیوں پر گم صم بیٹھے تھے۔ میں نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔ اس کیس نے مجھے اچھا خاصا پریشان کر دیا تھا۔ لاکھے نے مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر کہا۔

"خاں صاحب! مجھے اب اُس مکان کے در و دیوار سے وحشت ہونے لگی ہے۔ میری بیوی بھی بہت خوفزدہ رہتی ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ مکان کے گرد پولیس کی نفری میں اضافہ کر دیں۔" اُوپر تلے دو جوان بیٹوں کی موت نے اُس کا پہلے والا دَم خم چھین لیا تھا۔ اُس کی مالی حالت بھی دِن بدن خراب ہو رہی تھی۔ میں نے کہا "چودھری چھ چھ مسلح آدمی تیرے گھر پر دِن رات پہرہ دے رہے ہیں۔ جن پر تجھے زیادہ شک تھا وہ بھی سب حوالات میں ہیں۔ اَب ڈر کس بات کا؟" لاکھا اس جواب پر خاموش ہوگیا۔ مجھے چوری کے ایک اور کیس کے سلسلے میں جانا تھا۔ میں اُٹھ کر تیاری کرنے لگا۔ اتنے میں جودھ پُور کا پوسٹ ماسٹر دروازے پر نظر آیا۔ میں آگے بڑھ کر اسے فوراً دوسرے کمرے میں لے گیا۔ جودھ پُور کے ڈاک خانے کی نگرانی ہو رہی تھی لیکن پھر بھی مخبر پکڑا نہیں جا سکا تھا۔ اُس نے صرف ایک دن پہلے ایک لفافہ سپردِ ڈاک کیا تھا، اور وہ لفافہ پکڑے

ٹ ماسٹر میرے سامنے کھڑا تھا۔ بہرحال ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ میں نے لفافہ ا۔ کیا۔ کاپی کے ایک چھوٹے سے صفحے پر بعینہٖ یہ الفاظ لکھے تھے۔

"شب برات سے پہلے پہلے لاکھا کے چھوٹے پُتر کا کام مُک جائے گا۔"

ان ٹیڑھے میڑھے حروف میں ایک خوفناک دھمکی پوشیدہ تھی۔ اُن دنوں دیہی علاقوں میں ایسے ڈاکوؤں کی کہانیاں بکثرت گردش کرتی رہتی تھیں جو کہ ڈاکہ ڈالنے سے پہلے اس کی اطلاع دے دیتے تھے۔ یہ شخص بھی کسی ایسی ہی کہانی سے متاثر نظر آتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس شخص نے یہ خط لکھ کر لاکھا سنگھ کے گھر والوں کو مزید خوفزدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں لاکھے کو خط کے بارے میں بتا کر خط بھیجنے والے کا مقصد پورا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پوسٹ ماسٹر کو رخصت کر کے میں واپس کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر میں لاکھے سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر میں نے کہا کہ اگر وہ ضروری سمجھتا ہے تو میں اُس کے گھر کی حفاظت کے لئے کچھ اور آدمی بھیج دیتا ہوں۔ وہ میرے اس وعدے سے مطمئن نظر آنے لگا۔

ایک اور لاش

شام کے وقت میں نے اے ایس آئی گوبندر کے ساتھ پانچ مسلح سپاہی اور بھیج دیئے۔ میں نے گوبندر کو پُوری طرح چوکس رہنے کی تاکید کی۔ اس کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ چھیموں کے خاوند بلّے کو گرفتار کر لیا۔ وہ اٹھائیس انتیس سال کا ایک دُبلا پتلا شخص تھا۔ اس کے بال اور آنکھیں بھوری تھیں، اس کی لمبی لمبی نوک دار مونچھیں دیکھ کر مجھے خوامخواہ طیش آ رہا تھا۔ میں نے پہلے تو اُس سے نرمی سے پوچھ گچھ

کی لیکن وہ ہر بات سے انکار کرتا رہا۔ وقت کم تھا اور مجھے فوری معلومات درکار تھیں میں نے سپاہیوں کو اُس کی مرمت کرنے کا حکم دیا۔ دو گھنٹے تک تھرڈ ڈگری کے استعمال کے باوجود اس سے کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی تو میں نے مار پیٹ کا سلسلہ منقطع کروا دیا۔

لاکھا کے گھر وہ رات تو خیریت گزر گئی۔ شب برات میں ابھی ایک دن باقی تھا۔ اگلے دن شام کے بعد میں نے خود لاکھے کے مکان کے گرد حفاظتی انتظامات کا جائزہ لیا۔ انتظامات ہر طرح سے مکمل تھے اور اگر قاتل کوئی جن بھوت نہیں تھا تو حفاظتی گارد کو چکمہ دے کر گھر کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا..... اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ میں تھانے میں تھا اور بلّے سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے دفتر میں چلا گیا۔ کمرے کی عقبی کھڑکی کھلی تھی۔ یہاں سے دُور تک پھیلے کھیتوں کا سلسلہ صاف نظر آ رہا تھا۔ چاندنی بڑی خاموشی سے گاؤں کے مکانوں اور کھیتوں پر برس رہی تھی۔ میں کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ رات کے پچھلے پہر میرے اندر کا تھانیدار اُونگھنے لگا تھا۔ اُس وقت میں ایک عام آدمی کی طرح سوچ رہا تھا۔ میں نے سوچا اس گاؤں سے نجانے کتنی حسین دوشیزائیں اپنے محبوبوں سے ملنے کے لئے ان کھیتوں تک آتی ہوں گی؟ کتنے شوخ فقرے اور شرمیلی سرگوشیاں ان کھیتوں میں بکھری ہوں گی۔ ان ہی کھیتوں میں چور چھپے ہوں گے۔ ڈاکوؤں نے لوٹ کا مال دبایا ہوگا، قتل ہوتے ہوں گے، قبریں بنی ہوں گی، کتنی بے چین رُوحیں اب بھی یہاں بھٹک رہی ہوں گی۔ اچانک اے ایس آئی گوبندر بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں..... لاکھا کے مکان پر پھر قتل ہو گیا تھا۔ گوبندر نے بتایا

کہ تھوڑی دیر پہلے اندر سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ ہم بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے لیکن قاتل اپنا کام کر چکا تھا۔ میں اسی وقت موقع واردات پر پہنچا۔ ایک برآمدے میں دو بھینسوں کے پاس ایک چارپائی پر راجندر کی لاش پڑی تھی۔ اُس کی گردن سے خون ٹپک ٹپک کر زمین پر تالاب کی صورت میں جم چکا تھا۔ مقتول کے دائیں ہاتھ کی تین انگلیاں بھی کٹی ہوئی تھیں۔ اس دفعہ قاتل آسانی سے اپنا کام نہیں کر سکا تھا۔ اِرد گِرد کے جائزے سے پتہ چلتا تھا کہ وہاں کچھ دھینگا مشتی بھی ہوئی ہے۔ چارپائی کے پاس پانی کا ایک گھڑا ٹوٹا پڑا تھا اور لحاف بھی فرش پر گرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے قاتل نے حسبِ سابق چھری سے حملہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مقتول جاگ گیا تھا اور اس نے مزاحمت کی تھی۔ بعد میں قاتل نے اس کے سرہانے رکھی ہوئی بندوق پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی پہلی گولی تو چھت پھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ لیکن دوسری گولی نے مقتول کا کام تمام کر دیا تھا۔ یہ گولی اس کی ٹھوڑی میں داخل ہو کر سر کے پچھلے حصے سے نکل گئی تھی۔ گھر والوں کے پہنچنے تک قاتل فرار ہو چکا تھا۔ مقتول کی بندوق بھینسوں کی کھُرلی سے برآمد ہوئی تھی۔ یہ بھینسوں کی خوراک میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اور اس کے دستے پر انگلیوں کے نشان پائے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے گاؤں کے کھوجی کو بلوایا لیکن اس دفعہ بھی وہ کوئی اہم کھُرا اُٹھانے میں ناکام رہا۔ گھر کی عورتیں بلند آواز میں بین کر رہی تھیں۔ اور ان آوازوں کی شدت میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔ میری طبیعت سخت مکدّر ہو گئی۔ میں اے ایس آئی گوبندر کو ضروری احکامات دے کر تھانے لوٹ آیا۔

پریتم کہاں سے آگئی

اُس رات میں بالکل نہیں سو سکا۔ کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ اس کیس کے تمام

مشکوک کرداروں کو پکڑ کر تھانے میں لے آؤں اور اُن پر اس وقت تک سختی کروں جب تک قاتل کا پتہ نہ چل جاتے۔ حالات بہت بگڑ گئے تھے۔ اور کسی بھی وقت اعلیٰ افسروں کی طرف سے طلبی ہو سکتی تھی۔ چھیموں کا خاوند بلا ابھی تک بند تھا۔ سہ پہر کے وقت اُس کی بیوی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ روتی ہوئی تھانے آگئی۔ اُس نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور بچوں کا واسطہ دے دے کر کہنے لگی کہ میں اُس کے خاوند کو چھوڑ دوں۔ بلّے کو پکڑے رکھنے کا اب کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ غریب آدمی کو پانی پینے کے لئے ہر روز کنواں کھودنا پڑتا ہے۔ اگر وہ چند دن اور حوالات میں رہتا تو بچے بھوکوں مرنے لگتے۔ میں نے اُسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اچانک میں چونک گیا۔

بڑا لڑکا جس کی عمر کوئی بارہ تیرہ سال تھی۔ ہاتھ میں کتابیں پکڑے ہوئے تھا۔ شاید اس کی ماں اسکول سے سیدھا اُسے یہاں لے آئی تھی۔ کتابوں کے اوپر خاکی کاغذ کے کور چڑھے ہوئے تھے اور اُن پر سیاہ روشنائی سے نام وغیرہ لکھا تھا۔ "گلزار احمد ...... جماعت ششم ......" گلزار کے "گ" پر میری نظر اٹک کر رہ گئی۔ گ کے دونوں ڈنڈے سیدھے نہیں تھے۔ بلکہ مخصوص انداز میں لہرا کر لکھا گیا تھا۔ ایسا "گ" میں نے کہاں دیکھا تھا؟ اور پھر جیسے مجھے کرنٹ سا لگا۔ اس طرح کا حرف گمنام خطوں میں تھا۔ میں نے میز کی دراز سے وہ تمام خط نکال لئے۔ پھر میں نے لڑکے سے اس کی کاپیاں لیں اور تحریر کا موازنہ کرنے لگا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کاپیوں اور خطوط کی تحریر یکساں تھی

میں نے گھور کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس کیا اور خط اس کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

"یہ خط تم نے لکھے ہیں" لڑکا خاموش رہا۔ میں نے اپنا سوال پھر دُہرایا لیکن وہ خاموش

رہا۔ میرا زوردار تھپڑ کھا کر وہ اونچی آواز میں رونے لگا۔ میں نے اُسے ...پ کرایا۔ جیب سے ایک دھیلا نکال کر دیا اور پھر قدرے نرمی سے پوچھا۔ اس بار ...نے ایک حیرت انگیز انکشاف کیا۔ پہلے تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا لیکن ...وٹ نہیں بول رہا تھا......

یہ تمام خطوط اُس سے لاکھے کی بہو پریتم نے لکھواتے تھے۔ لڑکا پکی حویلی میں اپنی ...کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔ پریتم موقعہ ملنے پر اُس سے چند لائنیں لکھوا لیتی تھی۔ کچھ ...وہ اپنے میکے کے لئے لکھواتی تھی اور کچھ اسی گاؤں کے لئے۔ گلزار روزانہ بس پر ...میل کا سفر کر کے جودھ پور قصبے میں پڑھنے جاتا تھا۔ وہ ہی ان خطوں کو لیٹر بکس ...ڈال دیا کرتا تھا۔ مجھے ایک ایک کر کے پچھلے واقعات یاد آنے لگے کہ کس طرح ...ے کی بہو نے دو موقعوں پر میری تفتیش کو غلط رُخ پر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ ...دفعہ اس نے رنجیت کو ملوث کرنے کی کوشش کی تھی اور دوسری دفعہ چھیموں ...اُس کے خاوند کی لڑائی کا ذکر کر کے میرے شکوک کو پختہ کیا تھا...... لیکن وہ ...ل صورت سے تو ایسی عورت نظر نہیں آتی تھی۔ کیا وہ اپنے ہاتھوں اپنے خاوند ...ل کر سکتی تھی۔ کیا اُس نے اکیلے تین مردوں کو قتل کیا تھا؟ اگر اس کے ساتھ کوئی ...ک تھا تو کون تھا؟ مجھے بہت سے سوالوں کے جواب چاہئیں لیکن بہت ...ے وقت میں۔ میں نے اے ایس آئی گوبندر کو حکم دیا کہ وہ بلّے اور اس کے ...ی بچوں کو تھانے میں رکھے۔ میں نے چھیموں سے پریتم کے میکے کا پتہ دریافت ...اور گھوڑے پر کاٹھی ڈال کر روانہ ہو گیا۔ میرے ساتھ صرف بلال شاہ تھا چار ...کے سفر کے بعد شام قریباً چھ بجے ہم "سراہ والی" گاؤں پہنچے۔ اس گاؤں

میں ہمارا ایک مخبر موجود تھا۔ میں سیدھا اُس کے پاس گیا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ میں لاکھا کی بہو کے بارے میں معلومات چاہتا تھا۔ مخبر جس کا نام بوٹا تھا۔ اس بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ گاؤں کے ایک اور شخص کو لے آیا۔ یہ گاؤں کا نائی تھا۔ اور بڑا تیز وطرار آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے ایک گھنٹے میں پریتم کی زندگی کی پُوری کتاب ہمارے سامنے کھول دی۔

لاڈاں پٹی

اُس کی باتوں سے پتہ چلا کہ پریتم گاؤں کے چوہدری کی اکلوتی اولاد ہے۔ پریتم کو جنم دے کر اُس کی ماں مرگئی۔ چوہدری نے اُسے بڑے لاڈ پیار سے پالا۔ بے جا محبت نے اُسے بگاڑ دیا۔ وہ بہت خود سَر اور زبان دراز ہو گئی۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں اُس نے اپنی شرارتوں سے گاؤں بھر کا ناک میں دَم کر دیا وہ راہ چلتوں کی پگڑی کھینچ لیتی۔ گلی میں سوتے ہوئے لوگوں کی چارپائیاں اُلٹ دیتی۔ وہ کوٹھے پھلانگتی ہوئی گھروں میں گھس جاتی۔ لوگوں کے دودھ پی جاتی اور ان میں کیچڑ گھول دیتی۔ گاؤں کی ایک بھاری بھرکم عورت سرداراں تندوروالی سے اُسے خاص بیر تھا۔ اسے جہاں دیکھتی دھکا دے کر زمین پر گرا دیتی۔ اپنے بھاری بھرکم جسم کی وجہ سے سرداراں کو اُٹھنے میں کئی منٹ لگ جاتے۔ اس عرصے وہ اُس کے پاس کھڑی قہقہے لگاتی رہتی۔ کسی کو جرأت نہیں تھی کہ کسی بات پر اُسے ٹوکتا۔ سب ہنس کر یا رو کر چپ ہو رہتے۔ اس کے سب کھیل لڑکوں جیسے تھے۔ گلی ڈنڈا کھیلنا، گولیاں کھیلنا، لڑکیوں اور بعض اوقات لڑکوں سے زور آزمائی کرنا، چوری اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ

باغ میں گھس جاتی اور پھل کا ستیاناس کر دیتی۔ اُونچے اُونچے درختوں پر وہ ی کی طرح چڑھ جاتی تھی۔

چوری کی عادت اُس میں اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ ایک بار اُس نے چوروں کی باقاعدہ ڈھاٹا باندھ کر گاؤں کے ایک گھر سے زیورات چُرا لیے۔ رفتہ رفتہ ی کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اُس کے بے جا لاڈ پیار نے پریتم کو حد درجہ بگاڑ ے۔ لیکن اب پانی سَر سے گزر چکا تھا۔ وہ اگر اُسے کسی بات پر ٹوکتا تو وہ مشتعل تی اور اگلے دن کوئی اس سے بھی بڑا کارنامہ انجام دیتی۔ لیکن پھر ایسا ہوا م کی زندگی میں گاؤں کا ایک خوبرو جوان آگیا کچھ ایسے اتفاقات ہوتے کہ وہ ے محبت کرنے لگی۔ یہ نوجوان جس کا نام نعمت علی تھا۔ اُسی سرداراں کا لڑکا نے پریتم تنگ کیا کرتی تھی۔

پریتم، نعمت علی کے چوڑے چکلے سینے اور گھونگھریالے بالوں پر ایسی ریجھی کہ چوکڑی بھول گئی۔ جلد ہی گاؤں کے لوگ اُس میں ایک حیرت انگیز تبدیلی ں کرنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لڑکے سے لڑکی بن رہی ہو۔ بول چال سے ر روزمرّہ کی مصروفیات تک اس کا سب کچھ بدل گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے سکھ اں لی اور دبی زبان میں نعمت علی کو دُعائیں دینے لگے جس نے اس منہ زور ں کو لگام ڈالی تھی۔ پریتم جو پہلے سرداراں تندوروالی کو دیکھتے ہی اپنی آئی پر الی تھی اب ہر وقت اُس کی خدمت گزاری کا موقعہ تلاش کرتی رہتی —— ٹے پر اُس کا پانی بھرتی۔ گھر کے پچھواڑے اُس کے ساتھ اُپلے تھاپتی۔ بعض ات تو اُس کے لئے ایندھن بھی اکٹھا کر کے لاتی۔ گاؤں کے لوگ ساری بات

سمجھتے تھے لیکن کسی سکھ، مسلمان یا ہندو کو اتنی جرأت نہیں تھی کہ چوہدری کی بیٹی پہ انگلی اُٹھاتا۔

یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا ..... اور پھر ایک ایسا واقعہ ہُوا جس نے پریتم سے سب کچھ چھین لیا ——— سرداراں کا تندور گھر کے اندر ہی تھا۔ ایک رات شاید وہ اُسے ڈھانپنا بھول گئی۔ رات کو ہَوا چلی اور تندور کے قریب رکھے ہوئے ایندھن کے ڈھیر نے آگ پکڑ لی۔ چند لمحوں میں سارا گھر آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ گھر کے مکین سوتے ہوتے تھے۔ سرداراں اور نعمت علی سمیت آٹھ افراد میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ مرنے والوں میں بارہ سال سے کم عمر کے تین بچے بھی تھے ———

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ہی پریتم کی شادی ہو گئی۔

آتشزدگی کے اس واقعہ کے بارے میں میں نے پہلے بھی کہیں سنا تھا۔ حالات اور واقعات کی پُوری تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ میرا ذہن تیزی سے مختلف کڑیوں کو جوڑنے میں مصروف تھا۔ دو صورتیں ہو سکتی تھیں۔ آگ اتفاقیہ لگی تھی یا جان بُوجھ کر لگائی گئی تھی ——— یقیناً ..... یقیناً آتشزدگی کا واقعہ اتفاقیہ نہیں تھا.... آگ جان بوجھ کر لگائی گئی تھی۔ لیکن کس نے لگائی تھی.... ہو سکتا ہے یہ پریتم کے باپ کا کام ہو ..... لیکن نہیں ..... مُخبر کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس قسم کا کام خود نہیں کر سکتا ..... پھر پریتم کے سسرال والوں پر بھی شک کیا جا سکتا تھا۔ لیکن شک نہیں، یقین سے کہا جا سکتا تھا۔ یقیناً یہ لاکھے اور اس کے بیٹوں کا کام تھا۔ اس قسم کا کام وہی لوگ کر سکتے تھے.... شادی کے بعد پریتم کو اس گھناؤنے فعل کا پتہ چلا ہو گا اور ...... اور وہ سَر تا پا انتقام بن گئی ہو گی....

ں محبُوب کے لئے اُس نے اپنی زندگی بدل دی تھی وہ خدائی فوجداروں کے ھوں اپنی زندگی ہار گیا تھا..... اُسے جھوٹے نام و ناموس کی بھینٹ چڑھا یا گیا تھا..... وہ ایک بار پھر پرانی پریتم بن گئی ہو گی لیکن اس دفعہ اُس نے کوٹھے ں پھلانگے تھے، دودھ نہیں پیئے تھے..... چارپائیاں نہیں اُٹھائی تھیں.... س نے قتل کئے تھے، نہایت دلیری اور سفاکی سے۔ اس نے اپنے شریر ذہن کو ایک اور انداز سے استعمال کیا تھا۔ اُس نے اپنے دشمنوں میں نفاق کا بیج بویا تھا۔ اُنہیں کڑے ٹکڑے کیا تھا اور پھر چُن چُن کر مارا تھا..... میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ہ بپھری ہوئی سفاک قاتلہ لاکھے کے گھر موجود تھی.... تمام حفاظتی انتظامات کے باوجود لاکھے اور اُس کے اہلِ خانہ کی زندگیاں سخت خطرے میں تھیں۔ میں اپنی ٹوپی بھالتا ہُوا تیزی سے اُٹھا اور بلال شاہ کو ساتھ لے کر گھوڑوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

یہ وُہ نہیں تھی

چار گھنٹے کا سفر قریباً ڈھائی گھنٹے میں طے کر کے ہم گاؤں واپس پہنچ گئے۔ لاکھے کا مکان گاؤں کی بیرونی حدود میں تھا۔ مکان کے دروازے کے پاس دو سپاہی ٹہل رہے تھے۔ بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ بھی مسلح سپاہی موجود تھے۔ باقی جوان شاید اندر صحن میں چارپائیاں ڈالے بیٹھے تھے مجھے دیکھتے ہی سپاہیوں نے سلیوٹ کیا۔ سلیوٹ کی آواز سُن کر گوبندر سنگھ جلدی سے باہر آیا۔ بلال شاہ نے کہا۔

"کچھ اندر کا پتہ ہے آپ کو؟"

گوبندر نے اطمینان سے کہا سب ٹھیک ہے۔

"سب ٹھیک نہیں ہے" میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ رات کے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اندر کی طرف قدم بڑھاتا ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ لیکن اس چیخ میں خوف یا درد کی بجائے ایک وحشت سی تھی۔ گوبندر سنگھ میرے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اُسے سپاہیوں کے ساتھ پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اندر گھستا چلا گیا۔ صحن خالی تھا۔ میں بھاگتا ہوا مکان کے دوسری طرف گیا۔ تب اچانک اُوپری منزل کی ایک کھڑکی دھماکے سے کھُلی اور کسی شخص نے بڑی بدحواسی میں صحن میں چھلانگ لگا دی۔ وہ دھپ کی زوردار آواز سے نیچے گرا۔ ایک لمحے کے لئے ساکت رہا، پھر اُس نے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن لڑکھڑا کر گر گیا۔ کوئی سیڑھیوں پر سے بھاگتا ہوا نیچے آیا۔ میں اُسے جسم سے فوراً پہچان گیا وہ پریتم ہی تھی۔ اُس نے منہ پر شاید دوپٹے کا ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی چھری تھی۔ عین اُس لمحے زمین پر پڑا ہوا شخص چلانے لگا "بچاؤ...... بچاؤ" وہ ہمیں دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکی۔ اُس کے تیور خطرناک تھے۔ گوبندر سنگھ آگے بڑھا لیکن اُس نے اتنے جنونی انداز میں چھری گھمائی کہ وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔

بلال شاہ کا ذہن ایسے موقعوں پر تیزی سے کام کیا کرتا تھا۔ اُس نے کہیں قریب سے ایک اینٹ پکڑی اور تاک کر اُس کے سر پر نشانہ مارا لیکن نشانہ خطا گیا۔ اینٹ اچٹتی ہوئی اُس کے کندھے پر لگی۔ اُس نے ایک خوفناک چیخ ماری اور تیر کی طرح بلال کی طرف لپکی۔ بلال شاہ گھبرا کر اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا۔ صورتِ حال نہایت سنگین تھی۔ میں پستول نکال ہی رہا تھا کہ گوبندر سنگھ نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے پیچھے

لڑا لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ ہاتھا پائی میں اُس کا ٹا نکل چکا تھا۔ وہ پریتم ہی تھی۔ لیکن یہ وہ پریتم نہیں تھی جسے میں دو تین بار پہلے دیکھ تھا۔ وہ ایک بدلی ہوئی عورت تھی۔ اُس پر جنونی کیفیت طاری تھی۔ وہ نہایت یانہ انداز میں چیخ رہی تھی اور بار بار گوبندر کو دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کر رہی ۔ وہ چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ کچھ فقرے سمجھ میں آتے تھے اور کچھ نہیں "انہوں نے میرا ت چھین لیا۔ انہوں نے اُسے آگ لگا دی۔ میں بھی انہیں آگ لگا دوں گی۔ ان کی ل ختم کر دوں گی" گھر سے باہر گاؤں کے لوگ اکٹھے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے ے ایس آئی گرودت کو اشارہ کیا۔ اُس نے دو سپاہیوں کے ساتھ مل کر بمشکل پریتم کو ہتھکڑی لگائی۔ وہ اب زور زور سے رو رہی تھی۔ میں نے سامنے دیکھا لاکھا سنگھ خالی خالی ں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اپنے گناہوں پر غور کر رہا تھا۔ میں نے گوبندر کو اشارہ کہ لاکھے اور اس کے بیٹے کو بھی ہتھکڑی لگا دو۔ زمین پر گرنے سے لاکھے کے بیٹے کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔

اس کیس میں لاکھے اور اُس کے بیٹے کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ اُن پر یہ جرم ثابت ہو گیا کہ ں نے چند ماہ پہلے ذاتی عداوت کی بنا پر ایک گھر کو آگ لگا دی تھی جس کی وجہ سے آٹھ افراد ہو گئے تھے۔ پریتم کو سزائے موت سنائی گئی۔ اُس کے باپ نے اکلوتی بیٹی پر روپیہ پانی طرح بہایا۔ ہائیکورٹ نے اس کی کم عمری کو مدِنظر رکھتے ہوئے سزائے موت کو عمر قید میں ل دیا۔ میں نے سُنا ہے کہ اُس کا باپ جب بھی جیل میں اس سے ملنے گیا اس نے ملنے سے ار کر دیا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ "آٹھ افراد" کے وحشیانہ قتل میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ ایک مدت بیٹی کی صورت کو ترستا رہا اور آخر جیل اور گھر کے درمیان دھکے کھاتا ہوا مر گیا——!

زرینہ کے لئے

"رام پورہ" کا نام ذہن میں آتے ہی ایک واردات کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے۔ اُن دِنوں میں سب انسپکٹر تھا۔ ہُوا یوں کہ رام پورہ کے قریب سے گزرنے والی نہر میں ایک عورت نے اپنے دو بچّوں سمیت کُود کر خودکشی کر لی۔ مجھے دِن بارہ بجے کے قریب اس واقعے کی اطلاع ملی۔ سہ پہر کے وقت مَیں نے خود جائے حادثہ کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ جولائی اگست کے دن تھے۔ دُھوپ میں کافی شدّت تھی۔ مَیں اپنی گھوڑی پر سوار نہر کی طرف روانہ ہُوا۔ گاؤں سے نہر تک کوئی تین چار فرلانگ لمبا ایک کچّا راستہ جاتا تھا۔ جس وقت مَیں موقعہ پر پہنچا ٹوبے (غوطہ خور) تھک ہار کر پانی سے باہر بیٹھے ہوتے تھے۔

اُن کے تھکے ہوتے چہرے دیکھ کر مَیں سمجھ گیا کہ لاشوں کا کوئی سراغ نہیں مِلا۔ نہر کے کنارے بہت سے بچّے، بوڑھے، جوان جمع ہو گئے تھے۔ ایک طرف چند عورتیں اتمی انداز میں زمین پر بیٹھی تھیں۔ اے ایس آئی نے مجھے ایک زنانہ جُوتا اور سُرخ رنگ ے کپڑے کی ایک دھجی دکھائی۔ یہ کسی بچّے کے فراک کا ٹکڑا تھا۔ ان ہی دونوں اشیاء سے گاؤں والوں کو اندازہ ہُوا تھا کہ ریشماں نے اپنے بچّوں سمیت نہر میں کُود کر خودکشی

کر لی ہے۔ کسی نے اُسے چھلانگ لگاتے دیکھا نہیں تھا۔ صرف ایک کاشتکار نے اُسے بچوں کے ساتھ نہر کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ جبکہ نہر پر کپڑے دھونے کے لئے آنے والی دو عورتوں نے ریشماں کی جُوتی اور کپڑے کی دھجی پہچانی تھی۔

ریشماں کا کوئی رشتے دار اس گاؤں میں نہیں تھا۔ اس کا خاوند کام کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا تھا۔ بہرحال ریشماں کے اڑوس پڑوس کی کچھ عورتیں وہاں موجود تھیں میں نے اُن سے چند سوال کئے۔ انہوں نے بتایا کہ ریشماں اور اس کے خاوند لطیف میں ناچاقی پائی جاتی تھی۔ جن دنوں اُس کا خاوند گھر میں ہوتا تھا لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ جب میں نے عورتوں سے ریشماں کے چال چلن کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بیک زبان کہا کہ انہیں اُس میں کبھی کوئی بُرائی نظر نہیں آئی۔ ایک عورت بولی "کچھ لوگ کہتے ہیں کہ لطیف اُسے کہیں سے نکال کر لایا ہے لیکن کچھ بھی تھا اب تو وہ بڑی گھر گرہستی والی عورت نظر آتی تھی، اپنے بچوں پر جان چھڑکتی تھی اور خاوند کی خدمت گزاری میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھی" پاس پڑوس کی کچھ عورتوں کا خیال تھا کہ اُن کی گھریلو ناچاقی کی وجہ اس کے خاوند کی تلخ کلامی تھی۔ شاید وہ نرینہ اولاد کا خواہش مند تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ریشماں کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اُس کے گھر تین بچے پیدا ہوئے تھے اور تینوں لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکی فوت ہو چکی تھی۔ مجموعی طور پر سب نے ریشماں کے کردار کی تعریف کی۔ ان باتوں سے میرے خیال کی تصدیق ہوئی۔

ایک عورت کئی جنازے

میں خود بھی کسی حد تک ریشماں کو جانتا تھا۔ ان کا گھر تھانے سے زیادہ دُور

نہیں تھا۔ میں نے اُسے کئی بار تھانے کے سامنے سے گزرتے دیکھا تھا۔ سچی بات ہے کہ وہ ایک خوبصورت اور نہایت موزوں جسم کی مالک عورت تھی۔ میں ایک کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں۔ مجھے کبھی اس قسم کی باتوں سے دلچسپی نہیں رہی۔ یوں بھی لوگ پولیس والوں کی ہر حرکت کو دوسرے معنی پہنا لیتے ہیں۔ بہرحال وہ ایک ایسی عورت تھی جس پر نظر پڑنے کے بعد فوراً واپس نہیں آتی۔ میں نے اُسے کئی بار اُپلوں کا ڈھیر سر پہ رکھے گلی میں گزرتے دیکھا تھا۔ کبھی اُپلوں کی جگہ پانی کا گھڑا ہوتا تھا۔ ایک بچی اُس نے کولہے سے چمٹائی ہوئی تھی اور دوسری کو اُنگلی سے لگا رکھا ہوتا تھا۔ کولہے سے چمٹی ہوئی بچی کبھی تو انگوٹھا چوستی نظر آتی اور کبھی اُس کا ننھا مُنا ہاتھ ماں کے سینے پر گردش کرتا دکھائی دیتا۔ گاؤں کی زندگی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ زندہ رہنے کے لئے کیا مرد کیا عورتیں سب کو سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ گاؤں کی لڑکیاں شادی کے دو تین سال بعد ہی بڑھاپے کی طرف گامزن ہو جاتی ہیں۔ دو بچیوں کی ماں کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ کبھی اس عورت پر بھی جوانی آئی تھی۔ ..... ہاں تو میں ریشماں کا ذکر کر رہا تھا۔ اگر یہ میلی کچیلی عورت کہیں شہر میں ہوتی تو اس کے انداز ہی اور ہوتے۔

میں نے اپنے سامنے تیزی سے بہتی ہوئی نہر کو دیکھا۔ بارشوں کا موسم تھا اور پانی میں کافی شدّت محسُوس ہو رہی تھی۔ اَب یہاں سے لاشوں کا ملنا ایک مشکل امر تھا۔ میں نے اپنے محرّر کو ایک سپاہی کے ساتھ فوراً کبیر والا ہیڈ ورکس کی طرف بھیج دیا۔ وہاں کا انچارج مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ لاشوں کی دستیابی کے لئے پُورا تعاون کرے گا۔

دوسرے روز صبح مجھے جو پہلی خبر ملی وہ یہی تھی کہ تینوں لاشوں کو کبیر والا "سیفن" سے نکال لیا گیا ہے۔ یہ ایک سیدھا سادا خودکشی کا کیس تھا۔ گھریلو ناچاقی سے تنگ آکر ایک عورت نے خودکشی کر لی تھی۔ بہرحال کاغذی کارروائی ضروری تھی۔ مَیں نے نمبردار کے علاوہ گاؤں کے چند معززافراد اور اہلِ محلہ کے بیان قلمبند کئے۔ ریشماں کا خاوند بھی آچکا تھا۔ وہ اٹھائیس انتیس سال کا ایک خوش شکل آدمی تھا۔ لیکن اس وقت اُس کی حالت نہایت پتلی تھی۔ اس کی آنکھیں سُرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح خالی خالی نگاہوں سے اِردگِرد دیکھ رہا تھا۔ کبھی بیٹھے بیٹھے اچانک مُنہ چھپاکر رونے لگتا تھا۔ شاید اُسے پچھتاوے کی آگ جلا رہی تھی۔ مَیں نے اُس سے چند سوالات کئے۔ لیکن وہ کوئی ٹھکانے کا جواب نہ دے سکا۔ وہ بار بار اپنی بچیوں کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ اُس کی ایک پڑوسن نے روتے ہوئے بتایا۔

"مَیں نے اس ماں مارے کو کئی بار سمجھایا کہ ریشماں سے اتنی تلخی سے نہ بولا کر، وہ بات دِل کو لگا لینے والی لڑکی ہے لیکن یہ تو پُورا پُورا خاوند بننے پر تُلا ہوا تھا۔ جب بھی گھر آتا تھا اُسے رُلا کر جاتا تھا۔

شام کو ایک ساتھ جب تین جنازے اُٹھے تو گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ تینوں ماں بیٹیوں کی موت پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ جنازے میں شرکت کے بعد میں ایک ضروری کیس کے سلسلے میں ساتھ والے گاؤں چلا گیا۔ واپس آکر میں نے ابھی رات کا کھانا کھایا ہی تھا کہ ایک اور خبر ملی۔ ریشماں کے خاوند نے "پٹڑی" پر سر رکھ کر خودکشی کر لی تھی۔ یہ خبر سنتے ہی میری آنکھوں میں اس کا غمناک چہرہ گھوم گیا۔ میں نے اے ایس آئی ملہوترا کو موقع پر روانہ کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد لاش تھانے میں آگئی۔ ضروری کارروائی

کے بعد اُسے جالندھر پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دیا گیا۔

مَیں نے سوچا....

لطیف یا ریشماں کے رشتے داروں کو یا تو حادثوں کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی یا وہ جان بوجھ کر رام پورہ نہیں پہنچے تھے۔ لطیف کے صرف ایک چچا نے اُس کی بیوی اور بچّوں کی تجہیز و تکفین میں شرکت کی تھی۔ اتفاق سے وہ ابھی گاؤں ہی میں تھا۔ مَیں نے اُسے تھانے بُلایا اور کہا کہ وہ لطیف کے لواحقین سے رابطہ قائم کرے۔ اُس نے بتایا کہ لطیف کا باپ اور اس کے بھائی اس کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔ وہ اس کے بچّوں کی موت پر نہیں آئے، وہ اب بھی نہیں آئیں گے۔ اُس نے بتایا کہ وہ ریشماں کے میکے کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا لیکن اُسے اتنا یقین تھا کہ انہوں نے اپنی بیٹی کے ساتھ مرنا جینا ختم کر رکھا ہے۔

تھانہ بھی ایک مصیبتوں کا گھر ہوتا ہے۔ ہر وقت چوری، ڈکیتی، قتل کی وارداتوں کا ذکر جہاں ہر روز کوئی نیا پھڈا کھڑا ہو جاتے وہاں پُرانے پھڈے کم ہی یاد رہتے ہیں۔ شاید خودکشی کی یہ المناک واردات بھی آئی گئی بات ہو جاتی لیکن ایک واقعہ ایسا ہُوا جس نے مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبُور کر دیا۔ کبیر والا "سیفن" کا انچارج علی احمد خاں ایک روز تھانے آیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کچھ روز سے اُس کے ذہن میں ایک شک پرورش پا رہا ہے۔ وہ کچھ اُلجھا اُلجھا سا نظر آ رہا تھا۔ میرے پُوچھنے پر اُس نے بتایا کہ حادثے کے روز محرّر کے پہنچنے پر انہوں نے نہر میں جال لگایا تھا۔ جال لگانے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر تینوں لاشیں برآمد ہو گئی تھیں۔ اسے اُلجھن اس بات

کی تھی کہ ماں کی لاش بچیوں کی لاش سے کوئی پانچ منٹ قبل جال میں آ گئی تھی۔
علی احمد خاں کا پورا کا پورا خاندان پولیس کے محکمے سے وابستہ تھا۔ اپنے بھائیوں میں بھی صرف وہی اکیلا تھا جس نے پولیس کے علاوہ کسی اور محکمے میں ملازمت کی تھی۔ اُس کی فطرت میں تجسّس اور باریک بینی کا پایا جانا ایک قدرتی امر تھا۔

اُس کا کہنا تھا کہ اُسے شک ہے یہ کیس خودکشی کا نہیں۔ اب میں نے اُس کی بات پر غور کیا تو بے ساختہ اس کی ذہانت کی داد دینے کو دل چاہا۔ واقعی سوچنے کی بات تھی۔ ماں کی لاش دونوں بچیوں سے پہلے کیوں پہنچی۔ پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا، کہیں کوئی رکاوٹ وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اس بات کا امکان بھی نہیں تھا کہ دونوں بچیوں کی لاشیں ایک ساتھ کہیں پر اٹک گئی ہوں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی وارداتوں میں ماں عموماً پہلے اپنے بچوں کو پانی کے سپرد کرتی ہے۔

حیران کن بات تھی کہ نسبتاً بھاری بھر کم ہونے کے باوجود ماں کی لاش بچوں سے پہلے جال میں کیونکر پہنچ گئی؟ پھر مجھے واردات کے روز کا ایک واقعہ یاد آیا۔ اس واقعے پر میں پہلے بھی غور کر چکا تھا لیکن اُس وقت میری سوچ کا انداز مختلف تھا۔ میرے ایک سپاہی نے جو ذرا عاشق مزاج تھا اور عموماً عورتوں کے چکّر میں رہتا تھا، مجھے بڑے رازدارانہ طریقے سے بتایا کہ اُس روز دس گیارہ بجے کے قریب وہ بڑی خوش و خرّم تھانے کے قریب سے گزری تھی۔ وہ شاید دونوں بچیوں کو کنویں سے نہلا کر لا رہی تھی۔ میں اس وقت ایک آدمی سے گفتگو میں مصروف تھا اُس کی صرف ایک جھلک میں نے دیکھی تھی۔ یہ جھلک کئی بار میرے ذہن میں تازہ ہوئی تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اُسی عورت کی جھلک تھی جس نے صرف ایک گھنٹے بعد بچوں سمیت موت کو گلے لگا لیا تھا۔

بہرحال اب صورتِ حال مختلف ہو چکی تھی۔ تمام واقعات کو نئے سرے سے دیکھنا تھا۔ علی احمد اور میں کافی دیر گفتگو کرتے رہے۔ پھر اُس نے اجازت چاہی۔ میں نے تعاون کا شکریہ ادا کر کے اُسے رخصت کر دیا۔

میں نے تنہائی میں سوچنا شروع کیا۔ بالفرض ریشماں اور اُس کے بچوں کو قتل کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ قاتل کی غرض کیا تھی۔ کوئی زمین متنازعہ تھا، کوئی خاندانی رنجش تھی یا..... یا اس کے خاوند نے ہی اُسے قتل کر دیا تھا۔ آخری بات کسی صورت دل کو نہیں لگتی تھی۔ ٹھیک ہے میاں بیوی میں چپقلش رہتی تھی لیکن چھوٹی موٹی چپقلش کس گھر میں نہیں ہوتی۔ پھر وقوعہ سے پیشتر اُن کے درمیان کوئی سنگین نوعیت کا جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے تھانے میں اُس کے خاوند کی حالت دیکھی تھی۔ اس کے چہرے پر رنج و الم کے سائے بناوٹی نہیں تھے۔ وہ بار بار اپنی بچیوں کا نام لے کر پکار رہا تھا شاید اس کا خیال تھا کہ ریشماں نے اُس کے رویّے سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی ہے۔

بظاہر اُس کی اپنی خودکشی کی بھی یہی وجہ نظر آتی تھی۔ اُس کے اس اقدام کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے بال بچوں کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ باقی رہی خاندانی رنجش والی بات تو اس پر غور کیا جا سکتا تھا۔ لطیف کے چچا نے واضح طور پر کہا تھا کہ ریشماں اور لطیف کی شادی اُن کی باہمی محبت کا نتیجہ تھی اور اس شادی نے دونوں کو اپنے اپنے رشتہ داروں سے بالکل کاٹ دیا تھا۔ ہو سکتا تھا یہ ان دونوں میں سے کسی کے قریبی رشتے داروں کا کام ہو۔ لڑکی کے گھر والوں پر زیادہ شک کیا جا سکتا تھا۔ اس قسم کے معاملوں میں لڑکی والوں کا عموماً زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ بہرحال لڑکے والوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لطیف کے چچا کی باتوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ

لطیف کے بھائی اُس کے جانی دُشمن تھے۔ لطیف کے لڑکی نکال کر لے جانے کی وجہ سے ساری برادری میں اُن کی ناک کٹ گئی تھی۔ اس وجہ سے اُن کی ایک بہن کی منگنی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ لطیف کا بڑا بھائی جو بہت سخت مزاج اور غصیلا شخص تھا ایک دفعہ "رام پورہ" آکر اُس سے ہاتھا پائی بھی کر چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ لوگ لطیف سے زیادہ ریشماں سے عداوت رکھتے ہوں۔ انہوں نے موقع دیکھ کر اُسے بچّوں سمیت ٹھکانے لگا دیا ہو۔

لطیف کے گھر والوں سے رابطے کا واحد ذریعہ اُس کا چچا تھا۔ اُس کا نام شاید رحمت تھا۔ مَیں نے اگلے روز دو سپاہی اُس کے گاؤں بھیجے۔ سہ پہر کے وقت وہ تھانے حاضر ہو گیا۔ اس دفعہ مَیں نے کُرید کُرید کر اس سے لطیف کے گھر والوں کے متعلق کچھ اور سوال پُوچھے۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ لطیف کا بڑا بھائی فاسُو ایک خطرناک شخص تھا۔ کئی لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑ چکا تھا۔ اس کے ماضی کو دیکھتے ہوئے شبہ کیا جا سکتا تھا کہ اُس نے بھائیوں کے ساتھ مِل کر بھاوج کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔ رحمت کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ خود بھی اپنی برادری سے کٹا ہوا ہے۔ اُس نے بھی لطیف کی طرح اپنی مرضی سے شادی رچائی تھی اور سب سے الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی جو اُس نے لطیف کے گھر والوں کے متعلق مجھے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا تھا۔

پیر جی بھی ٹپک پڑے

دوسرے روز میں نے اے ایس آئی ملہوترا اور چند سپاہیوں کے ساتھ لطیف کے پہلے گاؤں کا رُخ کیا۔ یہ گاؤں دس بارہ کوس کے فاصلے پر ایک دوسرے تھانے کی

حدود میں واقع تھا۔ گرمیوں کی طویل دوپہر ہم نے کچے راستے پر دھول اڑاتے گذار دی گھوڑوں پر سوار جب ہم تھکے ہارے منزلِ مقصود پر پہنچے تو دُھوپ بھی ڈھلنی شروع ہو گئی۔ یہاں کا سکھ تھانیدار بڑا ملنسار اور خوش اخلاق آدمی تھا۔ اسے پہلوانی کا زبردست شوق تھا۔ یوں بھی وہ ایک شہ زور شخص تھا۔ میلوں ٹھیلوں میں ہونے والی کشتیوں میں بڑی باقاعدگی سے شرکت کرتا تھا۔ ہم اُسے تارا پہلوان کے نام سے یاد کرتے تھے۔ تارے نے تھانے میں میری خوب آؤ بھگت کی۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد میں نے آنے کا مقصد بیان کیا۔ لطیف کے بڑے بھائی فاسُو کا نام سُن کر وہ چونک گیا۔ جب مَیں نے اُسے بتایا کہ فاسُو پر مجھے فلاں نوعیت کا شک ہے تو اُس نے دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ قتل کی واردات میں فاسُو کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔

مَیں نے پُوچھا کہ وہ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتا ہے۔ ٹھیک ہے وہ اُس کے تھانے کا رہائشی تھا لیکن پولیس والے کا تو کام ہی ہر شخص پر شک کرنا ہوتا ہے۔ میری بات سُن کر وہ مُسکرا دیا۔ اُس نے کہا۔

"نواز خاں! فاسُو کو جتنا مَیں جانتا ہوں شاید اس کے ماں باپ بھی نہیں جانتے۔ یہ اُستاد فاسُو ہی ہے جس نے مجھے پہلوانی کا شوق دلایا اور اکھاڑے کے داؤ پیچ سکھائے۔ وہ ایک زبردست پہلوان ہے۔ پہلوانی کے سوا نہ اُسے کچھ آتا ہے اور نہ ہی اُسے کسی چیز میں دلچسپی ہے۔ وہ تو بڑا نر آدمی ہے وہ کسی عورت کو قتل کیوں کرنے لگا۔

"میں نے اُسے بتایا کہ مجھے تو اس کے بارے میں بالکل مختلف رپورٹ ملی ہے۔ سُنا ہے وہ نہایت خطرناک شخص ہے۔ کئی افراد کے ہاتھ پاؤں توڑ چکا ہے"۔

تارے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "بات تو تمہیں کسی نے ٹھیک بتائی ہے۔

لیکن قاسو خطرناک صرف اکھاڑے میں ہوتا ہے اور ہاتھ پاؤں بھی اُس نے پہلوانوں کے ہی توڑے ہیں۔ دو دفعہ تو میرا کندھا اُترا ہے اس کے ہاتھوں میں اُس کی حمایت میں اس لئے نہیں بول رہا کہ وہ میرا اُستاد ہے۔ تفتیش کے بعد بھی تمہیں آخر اسی نتیجے پر پہنچنا ہے...... دراصل تمہیں صحیح اطلاع نہیں دی گئی۔"

بہرحال میرے کہنے پر اُس نے آدھ گھنٹے کے اندر اندر قاسو اُس کے باپ اور بھائیوں کو تھانے میں بُلا لیا۔ قاسو کا چہرہ واقعی کسی قاتل کا چہرہ نہیں تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ لیکن صحت بہت اچھی تھی۔ گفتگو سے وہ ایک سیدھا سادا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ دونوں چھوٹے بھائی بھی چہرے مہرے سے شریف ہی نظر آتے تھے۔ اُن کا باپ سُرخ وسپید چہرے والا ایک باریش شخص تھا۔ اُس کے ماتھے کی محراب اُسے ایک مذہبی شخص ظاہر کرتی تھی۔ بیٹے اور اُس کے بچوں کی ناگہانی موت پر وہ ملول ضرور تھا لیکن اپنے رویے پر پشیماں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"تھانیدار جی! جو خُدا اور اُس کے رُسول کا دُشمن وہ ہمارا دُشمن۔ لطیف میرے اور میرے گھر والوں کے لئے اُسی وقت مر گیا تھا جب پانچ سال پہلے اُس نے مرضی سے شادی رچائی تھی۔ ہمارا جینا مرنا ختم ہو چکا تھا۔"

میں نے کہا "بزرگو! تم یہ بات اپنے متعلق تو کہہ سکتے ہو لیکن اپنے گھر والوں کے متعلق نہیں کہہ سکتے۔"

قاسو شاید میرا اشارہ سمجھ گیا تھا، کہنے لگا "تھانیدار جی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ چند ماہ پہلے میں لطیف سے ملنے کے لئے رام پورہ گیا تھا۔ چھوٹے بھائی کی محبت مجھے کھینچ کر وہاں لے گئی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں غلطی پر تھا۔ دراصل اُن دنوں

ہمیں پہلی بار پتہ چلا تھا کہ وہ رام پورے میں رہتا ہے اور اُس کے دو بچے بھی ہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ خبر اُس کے سسرال بھی جا پہنچے گی۔ جب اُن لوگوں کو پتہ چلے گا کہ اُن کی لڑکی کو بھگا لے جانے والا فلاں جگہ رہتا ہے تو وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ اُسے یا اُس کے بچوں کو نقصان پہنچائیں۔ میں نے ضروری سمجھا کہ لطیف سے مل کر اس خطرے سے آگاہ کروں اور کسی اور جگہ منتقل ہونے کا مشورہ دُوں۔ میں نے اُس سے مل کر اُسے بڑی نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ میری ہر بات کا اُلٹا مطلب لیتا رہا۔ اُس نے بڑے طیش سے کہا میں یہیں رہوں گا اور ٹھونک بجا کر رہوں گا، تم سے اور تمہارے باپ سے جو کچھ ہوتا ہے وہ کر لو۔ اُس کا خیال تھا کہ میرے اُس کے پاس آنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی میں علیحدگی ہو جائے۔ اُس کی اُلٹی باتوں پر مجھے بھی طیش آ گیا۔ میں نے اُسے تھپڑ مارا اور وہ مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ مجھے اُس سے یہ اُمید نہیں تھی...... میں روتا ہوا وہاں سے واپس آیا۔"

قاسو پہلوان کی آنکھوں میں پھر آنسو چمک رہے تھے۔ اُس کے باپ نے تند لہجے میں کہا۔

"وہ تھا ہی بڑا بدفطرت، کوئی اچھائی کرتا تھا تو اُسے بھی بُرائی سمجھتا تھا۔ یہ جو کچھ ہوا ہے سب اُس کے کرموں کا پھل ہے۔"

میں نے اُن سے پوچھا "آپ لوگوں کو کس پر شک ہے؟"

اُس کے باپ نے کہا "ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ہمیں کسی پر شک کرنے کی ضرورت ہے۔"

مجھے اُس کے باپ کی بے حسی پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے ذرا تھانیداری لہجے میں کہا "بزرگو! یہ بات نہ کرو۔ تعلق تو تم سب کا بنتا ہے۔ وہ تمہارا بیٹا تھا۔ تمہارے بیٹے کو تم سے ایک عورت نے چھین لیا۔ وہی عورت اپنے بچوں سمیت قتل کر دی گئی۔ تعلق کیسے نہ بنا تمہارا؟ اب اگر تم لوگ مجھے کچھ بتاؤ گے نہیں تو بات کیسے بنے گی؟

قاسو میرے لہجے کی گرمی محسوس کرکے بولا "تھانیدار صاحب شک والی تو کوئی بات ہی نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر لطیف کے بیوی بچے قتل ہوئے ہیں تو اس کے سسرال والوں نے کئے ہیں۔

میں نے پوچھا "خاص طور پر تمہیں کس پر شک ہے؟"

قاسو نے کہا۔ کسی ایک پر شک تو ہم نہیں کر سکتے۔ بہرحال ریشماں کے دو بڑے بھائی خاص طور پر ابھرے ہیں۔ پہلے پہل انہوں نے ہمیں بھی بہت دھمکیاں دیں تھیں لیکن اب سال ڈیڑھ سال سے خاموش ہیں۔

قاسو کے ایک بھائی نے کہا "تھانیدار جی! آپ کو ان کے گھر کے اندرونی حالات کے بارے میں ٹھیک ٹھیک باتیں عبداللہ ہی بتا سکتا ہے۔ سُنا ہے یہ شخص پیری مریدی کرتا ہے۔ ریشماں کے گھر والے اس کے زبردست مرید ہیں۔ ہر کام کرنے سے پہلے وہ اُس سے مشورہ لیتے ہیں۔ یہ شخص "مہندی پور" میں رہتا ہے۔

"مہندی پور میرے ہی تھانے کا ایک موضع تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا لیکن عبداللہ نامی کسی پیر فقیر کا چہرہ ذہن میں نہیں آیا۔ رخصت ہونے سے قبل میں نے لطیف کے گھر والوں اور خاص طور پر اُس کے والد سے کہا کہ مرنے والا مر گیا۔ اب وہ قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے پوری ایمانداری کے ساتھ پولیس سے تعاون کریں

...یں ان کی پوری حفاظت کرے گی۔ میں نے تارا سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ کہیں کھویا ...ا اپنے بازوؤں کے مسل ٹٹول رہا تھا۔ چونک کر بولا "بالکل بالکل۔ یہ بھی کوئی کہنے ...ی بات ہے بادشاہو"۔

سنہرے بالوں والی لڑکی

اس سے اگلے روز میں نے ملہوترا کو ایک سپاہی دے کر مہندی پور بھیجا۔ وہ ڈیڑھ ...عد عبداللہ کو تھانے لے آیا۔ میری توقع کے برعکس وہ تیس بتیس سال کا ایک جوان ...س تھا۔ داڑھی مونچھ بالکل صاف تھی۔ پہلے تو مجھے شک ہوا شاید ملہوترا کسی اور شخص ...پکڑ لایا ہے لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی پیری مریدی والا عبداللہ ہے۔ عبداللہ ...ا آنکھیں سرخی مائل اور چمکدار تھیں۔ پہلی نظر میں ہی وہ مجھے ایک چالاک اور گہرا شخص ...ائی دیا۔ بہرحال اس وقت وہ کچھ ڈرا ڈرا سا تھا۔ میں نے پہلے تو اس کا رہا سہا ...اد دور کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ کافی سے زیادہ ڈر چکا تو میں نے اُس سے ...ں کے گھر والوں کے بارے پوچھ گچھ شروع کی۔ وہ تھوڑا سا جھجکا۔ میں نے سرد ...یں کہا۔

"دیکھ میاں۔ میں دم درود کا منکر نہیں ہوں لیکن میرے پاس جو جن ہے وہ ایک بار ...ں چھٹ گیا تو سارے وظیفے دھرے رہ جائیں گے۔ اگر بیس سال جیل کاٹنے کا ارادہ ...تو خوشی سے چپ رہو ورنہ سب کچھ صاف صاف کہہ دو"۔

"اس نے اٹک اٹک کر جو باتیں بتائیں ان کا لب لباب یہ ہے" ریشماں کے ...ب نواز کے دونوں بڑے بیٹے پانچ چھ مہینے سے ایک مقدمے میں جیل

بھگت رہے ہیں۔ چھوٹا بیٹا گھر میں ہے لیکن وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہے۔ اُس سے یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ اُس نے تہرے قتل کی واردات کی ہو۔ رب نواز خود کافی بوڑھا ہو چکا ہے اور یوں بھی بیمار رہتا ہے۔

عبداللہ کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ رب نواز اور اس کے بیٹوں کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر اُسے آنکھیں دکھائیں تو اُس نے کہا۔

"تھانیدار صاحب! اگر رب نواز کے دونوں بیٹے جیل میں نہ ہوتے تو میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ واردات میں اُن کا ہاتھ ہے..... کیونکہ پچھلے دنوں انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ لطیف "رام پورے" میں رہتا ہے۔ انہوں نے جیل سے رہا ہوتے ہی اس کا کام تمام کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا "اس کا مطلب ہے تمہیں اس منصوبے کا علم تھا۔ پھر بھی تم نے پولیس کو اطلاع نہیں دی۔ کیا میں تمہیں بھی اُن کا ساتھی سمجھوں"۔

"جی..... نہیں..... جی"۔ وہ بُری طرح گڑبڑا گیا اور بیگناہی کی قسمیں کھانے لگا۔ میری نظروں میں اُس کا کردار کچھ مشکوک ہو گیا تھا۔ بہرحال میں نے اس شرط کے ساتھ اُسے جانے کی اجازت دے دی کہ وہ کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائے گا اور اطلاع دیئے بغیر تھانے کی حدود سے باہر نہیں جائے گا۔

وہ اُٹھ کر گیا ہی تھا کہ لطیف کا چچا رحمت آ گیا۔ میں نے اُسے خود تھانے بُلوایا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ رحمت کا اس قتل میں کوئی ہاتھ ہو۔ بھائیوں کے ساتھ اُس کی دُشمنی اس کی غلط بیانی سے ظاہر ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنے

...بیوں تھا سو پہلوان وغیرہ کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ اس سے بالکل مختلف نکلے تھے۔ لطیف کی طرح وہ بھی خاندان برادری سے کٹا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے اُس نے بھائی کی دشمنی بھتیجے سے لی ہو۔ بھتیجے کا گھر برباد کر کے اُسے والدین سے لڑانے کی کوشش کی ہو۔ میں نے ...سے چند سوالات کئے۔ اُس کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ لطیف کے گھر صرف دو تین دفعہ آیا تھا۔ ہاں لطیف اور ریشماں اُس کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔

میں نے اُس سے کہا "ریشماں! واردات کے روز اپنے بچوں کو نہلا دھلا کر کہیں روانہ ہوئی تھی۔ اُس نے پڑوس کی عورت سے کہا تھا کہ وہ کل آئے گی۔ تمہارے گھر کے علاوہ وہ کہیں آتی جاتی بھی نہیں تھی۔ تمہارا کیا خیال ہے وہ تمہارے ہاں آ رہی تھی؟"

رحمت نے کہا "وہ صرف ایک ہفتہ پہلے ہمارے ہاں آئی تھی اور پھر جس راستے پر وہ جا رہی تھی وہ ہمارے گاؤں کو نہیں جاتا۔ میرا خیال ہے وہ کہیں اور جا رہی تھی"۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے ایک مخبر اُس کے پیچھے لگا دیا۔ اب میں نے اس بات پر غور شروع کیا کہ ریشماں واردات کے روز کہاں جا رہی تھی؟ مجھے اندازہ ہوا کہ ریشماں کے سلسلے میں میری معلومات ابھی کافی محدود ہیں۔ میں نے اس کے پڑوس کی دو عورتوں کو پھر تھانے بُلایا اور نئے سرے سے پُوچھ گچھ کی۔ دونوں عورتوں نے بتایا کہ ریشماں مہینے میں ایک آدھ بار اپنے کسی چچا سے ملنے جایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ میرے اس سوال پر کہ اُس کے گھر کون کون آتا تھا۔ ایک عورت کچھ یاد کرتے ہوئے بولی "محلے کی عورتوں کے علاوہ صرف ایک نوجوان لڑکی کبھی کبھی اُس سے ملنے آتی تھی۔ یہ ایک اہم اطلاع

سے معذوری ظاہر کی یا شاید پریشانی کی وجہ سے اُنہیں یاد نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سنہری بالوں والی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اور ساتھ والے گاؤں سے آتی تھی۔ میں نے پُوچھا کیا وہ خاص طور پر صرف ریشماں ہی سے ملنے آتی تھی۔ ایک عورت کو کچھ یاد آرہا تھا۔ اُس نے کہا "تھا نیدار جی! مجھے یاد آرہا ہے ریشماں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ...... ہاں زرینہ نام تھا اُس کا...... ریشماں نے کہا تھا کہ زرینہ اپنی پھوپھی سے ملنے آتی ہے۔ ایک دفعہ تو مجھے اس پر شک بھی ہوا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اُس کی پھوپھی ارائیوں کے محلے میں رہتی ہے۔ لیکن میں نے کبھی اُس کی پھوپھی کو اُس کے ساتھ نہیں دیکھا۔ نہ ہی اُس نے کبھی ریشماں کو اپنی پھوپھی سے ملایا۔

عبداللہ مشکوک تھا!

وہ لڑکی کون تھی جو ریشماں سے ملتی تھی۔ میں نے اپنے مخبروں کو ارائیوں کے محلے میں چھان بین کرنے کو کہا۔ لیکن زرینہ اُس کی پھوپھی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس کا مطلب تھا زرینہ نامی یہ لڑکی مشکوک تھی۔ پڑوس کی عورتوں کے مطابق خودکشی کے واقعے سے دو روز قبل بھی وہ لڑکی ریشماں کے گھر آئی تھی۔ ہو سکتا تھا اس لڑکی کی ریشماں کے ہاں آمدورفت کا قتل سے گہرا تعلق ہو لیکن اس لڑکی کا پتہ کیسے چلایا جائے۔ کچھ معلوم نہیں تھا وہ کون تھی؟ کہاں سے آتی تھی۔ اگر واقعی اُس کا قتل میں ہاتھ تھا تو اُس کے دوبارہ یہاں آنے کی توقع نہیں تھی۔ بہرحال میں نے پڑوس کی عورتوں اور اپنے مخبروں کو اس بارے میں خبردار کر دیا۔

تمام راستے ایک مقام تک پہنچ کر ختم ہو گئے تھے۔ ریشماں کے باپ سے بھی

مُلاقات ہو چکی تھی۔ اُس کے دونوں بیٹے واقعی جیل میں تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ اب آگے بڑھنے کے لئے کسی مخبر کی حوصلہ افزا رپورٹ ملنا ضروری تھی۔ تقریباً دو ہفتے گزر گئے لیکن کسی قسم کی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ ایک موقع پر تو مجھے بھی شک ہونے لگا کہ شاید یہ خودکشی کا ہی کیس ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ سے ماں کی لاش بچیوں سے پہلے "سیفن" پر پہنچ گئی ہو...... لیکن پھر مجھے واردات کے روز ریشماں کی جھلک یاد آئی جو میرے عملے کے سپاہی نے مجھے دکھائی تھی۔ اور میں سوچتا کہ وہ بڑے ناز سے اپنے دُھلے ہوئے بالوں کو شانوں پر پھیلائے بچّوں کے ساتھ گلی سے گزر رہی تھی۔ کیا وہ خودکشی کرنے جا رہی تھی؟ نہیں۔ یہ بعید از قیاس ہے...... اور پھر سنہری بالوں والی وہ نامعلوم لڑکی پیچھے ہٹنا اب اتنا آسان نہیں تھا۔ ٹھیک ہے اس کیس کی پیروی کوئی نہیں کر رہا تھا لیکن شاید...... میں خود اس کی پیروی کر رہا تھا۔

بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ جب آدمی کسی کام کو کرنے کا عزم کرلے تو راستے خود بخود نکلے چلے جاتے ہیں۔ خُدا کو وہ لمحہ بہت پیارا ہوتا ہے جب کسی بندے کی ہمت ٹوٹ کر پھر بندھتی ہے...... میں نے کیس کی فائل نکالی اور اُسے نئے سرے سے کھنگالنے لگا۔ تب اچانک قدموں کی آواز آئی میں نے سر اُٹھایا تو قاسو پہلوان میرے سامنے تھا۔ آؤ پہلوان میں نے اس سے مصافحہ کر کے کُرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ بہت دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک نیک فطرت انسان ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی کی ہزار خامیوں کے باوجود اُسے اُس سے محبّت تھی۔ اس وقت بھی وہ اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے آیا تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے عبداللہ کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ بڑا فریبی آدمی ہے۔ اُس کی پیری فقیری سب ڈھونگ ہے۔ ایک دفعہ اس نے ایک کمسن لڑکی کو جن نکلنے کے

Pakistanipoint
Waqar
Azeem

بہانے کمرے میں بند کر لیا۔ بعد میں لڑکی نے والدین سے شکایت کی کہ پیر صاحب اُسے کپڑے اُتارنے کو کہتے تھے۔ ریشماں کے گھر والوں کو اُس میں نجانے کیا نظر آتا ہے ورنہ اس کے اپنے گاؤں والے بھی اُسے منہ نہیں لگاتے۔ اُس کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ عبداللہ پوست کا نشہ کرتا ہے۔ پوست کے ذکر پر میں چونک گیا۔ مقدمے کی فائل میرے سامنے ہی پڑی تھی۔ مَیں نے لطیف کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نکالی۔ کیمیکل ایگزامینر کے مطابق متوفی کے معدے میں پوست کے اجزا پائے جاتے تھے۔ دوسرے نشوں کی نسبت پوست کا استعمال اتنا عام نہیں کیا جاتا۔ اس اتفاق نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ عبداللہ جو پہلے ہی میری نظروں میں مشکوک تھا اب اور مشکوک ہو گیا تھا۔

مَیں نے اگلے روز پہلا کام یہ کیا کہ "مہندی پور" کے ایک خاص مُخبر کو عبداللہ کی نگرانی پر لگا دیا۔ مخبر نے تیسرے ہی روز ایک چونکا دینے والی خبر سنائی۔ اُس نے بتایا کہ سنہرے بالوں والی ایک لڑکی عبداللہ سے ملنے اس کے ڈیرے پر آتی ہے۔ کل شام بھی وہ اس سے ملنے آئی تھی۔ دونوں نے کوئی دو گھنٹے تنہائی میں گزارے لگتا ہے کہ اُن دونوں میں پیری مریدی کے علاوہ بھی کوئی رشتہ ہے۔ یہ بہت اہم خبر تھی۔ مَیں نے مخبر کو شاباش دے کر واپس بھیجا۔ اور اُسے کہا کہ احتیاط سے نگرانی کا کام جاری رکھے۔ مسئلہ کچھ اُلجھ رہا تھا لیکن یہ بڑی بات تھی کہ سنہری بالوں والی لڑکی کا کھوج کھُرا مل گیا تھا۔ ریشماں کے والدین اور عبداللہ کا رابطہ تو سمجھ میں آتا تھا۔ لیکن یہ سنہری بالوں والی لڑکی کون تھی۔ یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ اس واردات میں اس لڑکی کا کردار کس نوعیت کا تھا؟ دو صُورتیں ہو سکتی تھیں، عبداللہ نے اس لڑکی سے کام لیا تھا یا وہ عبداللہ سے کام لے رہی تھی۔ ..... اگر وہ اس سے کام لے رہی

ی تو کیوں؟ اُسے ریشماں کے قتل سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ وہ لطیف سے مادی کرنا چاہتی تھی۔ اس سے کوئی انتقام لے رہی تھی؟ کس چیز کا انتقام؟

اُس روز کافی گرمی پڑ رہی تھی۔ مَیں ایک چھوٹے سے ہوٹل کے اندر کُرسی پر بیٹھا ما۔ سامنے بسوں کے اڈے پر پولیس کے چھ جوان سادہ کپڑوں میں گھوم رہے تھے۔ مخبر ا اطلاع کے عین مطابق زرینہ بس اڈے پر پہنچ چکی تھی۔ اُس نے بوسکی رنگ کی ایک لمبی سی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ایک بڑا سا صندوق اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ وہ بے چینی سے ٹانگوں کے اسٹینڈ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بائیس تیئیس سال کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ دُھوپ کی وجہ سے اس کا رنگ بالکل سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ بسوں کے کنڈکٹر اور ڈرائیور اُسے گھُور گھُور کر دیکھ رہے تھے شاید اسی لئے وہ کچھ گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ بار بار چادر کے پلّو سے پہرہ ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب ایک تانگے سے عبداللہ اترتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا سیدھا زرینہ کے پاس پہنچا۔ دونوں تھوڑی دیر کھُسر پھُسر کرتے رہے۔ پھر عبداللہ نے ٹکٹیں لیں اور وہ دونوں چنڈی گڑھ جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔ یہ بس اُس ہوٹل کے عین سامنے کھڑی تھی جس کے اندر مَیں بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اے ایس آئی ملہوترا اور پولیس کے دو جوان بس میں داخل ہوتے انہوں نے عبداللہ اور زرینہ سے کہا کہ وہ دونوں نیچے اُتر آئیں۔ عبداللہ شاید پولیس والوں کو پہچان نہیں سکا تھا۔ اُس نے کہا۔

"کیا بات ہے جوانو، جو بات کرنی ہے یہیں پر کرو" اتنے میں زرینہ بھی پٹاخ پٹاخ بولنے لگی۔ وہ بڑی ہوشیار عورت دکھائی دیتی تھی۔ بس کی تمام سواریاں بھی

سمجھ رہی تھیں کہ وہ اُس کی بیوی ہے جو اپنے خاوند کی حمایت میں بول رہی ہے۔ اُس کے اس طرح بولنے سے عبداللہ بھی شیر ہو گیا تھا اور اُٹھ کر اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا میں اطمینان سے چلتا ہوا باہر نکلا۔ میرا چہرہ دیکھ کر عبداللہ کی سٹی گم ہو گئی۔ زرینہ ابھی تک بولے جا رہی تھی۔ میں نے عبداللہ کو ایک موٹی سی گالی دی اور گردن سے دبوچ کر کہا۔

"اوئے! تجھے تو میں نے کہا تھا مجھے بتائے بغیر گاؤں سے باہر نہ جانا تو کدھر کو جا رہا ہے؟ پھر میں اُسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ اب زرینہ اُونچی آواز میں واویلا کر رہی تھی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات یکدم بدل گئے تھے۔ میں نے بڑی نرمی سے پُوچھا۔

"بی بی! تم اس لفنگے کے ساتھ کہاں؟ مجھے معلوم تھا وہ کیا جواب دے گی۔ کہنے لگی "تھانیدار صاحب، یہ مجھے دھوکے سے یہاں لایا ہے، میں اپنی مرضی سے نہیں آئی"۔

گھبراہٹ میں لوگ ایسی ہی اُلٹی سیدھی ہانکنے لگتے ہیں۔ میں نے بُوٹ کی ٹھوکر عبداللہ کی کمر پر لگا کر کہا "چل ہاں پتر ذرا تھانے تیری پیری مُریدی میں دیکھتا ہوں۔ زرینہ کو صورتِ حال اور اپنے بیانوں کی گڑبڑ کا بالکل اندازہ نہیں ہوا تھا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا ..... ورنہ جس قسم کی وہ لڑکی تھی، تھانے جاتے جاتے اُس نے بے حد شور مچانا تھا۔ عام سی واردات تھی لیکن ..... شام سے پہلے پہلے زرینہ اور عبداللہ نے سب کچھ اُگل دیا۔ کیس بالکل واضح تھا۔ زرینہ نے اپنے کردار سے عورت کا ایک نہایت گھناؤنا رُوپ پیش کیا تھا۔ وہ ریشماں کی رشتے دار اور نہایت قریبی سہیلی تھی۔ دراصل

وہ بھی لطیف سے محبّت کرنے لگی تھی لیکن لطیف صرف ریشماں کو چاہتا تھا زرینہ حالانکہ ریشماں سے زیادہ خوبصورت تھی لیکن ہزار کوشش کے باوجود وہ لطیف کو اپنی جانب مائل نہیں کر سکی۔ وہ لطیف پر جان دیتی تھی اور لطیف ریشماں کا دیوانہ تھا۔ وہ ایک عرصے تک چُپکے چُپکے رقابت کی آگ میں جلتی رہی۔ بعد میں لطیف ریشماں کو نکال کر لے گیا۔ یہ زرینہ ہی تھی جس نے سب سے پہلے لطیف کا کھوج لگایا۔ اس مقصد کے لئے اُس نے جھاڑ پھُونک کرنے والے عبداللہ کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اپنے حُسن کی چکاچوند دکھا کر اُس نے عبداللہ کو مجبور کیا کہ وہ لطیف اور ریشماں کا سراغ لگائے۔ جب اُن کا سراغ مل گیا تو اُس نے ایک نیا کھیل شروع کیا۔ وہ ریشماں کا گھر برباد کرنے کی نیّت لے کر اس کے پاس پہنچی۔ اُس نے یوں ظاہر کیا جیسے اُن کی مُلاقات اتفاقاً ہو گئی ہے۔ ریشماں نے اس پر یقین کر لیا اور بچپن کی سہیلی سے اپنا تمام دُکھ سُکھ بیان کیا۔ اس نے زرینہ کو بتایا کہ اس کا خاوند نرینہ اولاد کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ اگر اس دفعہ بھی اُس کے ہاں لڑکا پیدا نہ ہوا تو لطیف کا رویّہ بدل جائے گا اور اُن کی گھریلو زندگی تلخ ہو جائے گی۔ زرینہ کے لئے یہ صورتحال نہایت سازگار تھی۔ وہ ریشماں کو فوراً عبداللہ کے پاس لے گئی۔ عبداللہ نے بھولی بھالی ریشماں کو چند ہی ملاقاتوں میں اپنے "فقیری" شکنجے میں جکڑ لیا۔

وہ جھاڑ پھُونک کے لئے اُسے وقتاً فوقتاً اپنے گھر بُلانے لگا۔ ریشماں بیچاری ان باتوں کو نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اپنے مجازی خُدا کو خوش کرنے کے لئے سب کچھ کر رہی تھی۔ اُس کے دِل میں بس یہی آرزو تھی کہ کسی طرح لڑکے کی ماں بن کر اپنے محبُوب خاوند کو خوش کر سکے۔ دوسری طرف زرینہ لطیف سے ملی اور بڑی ہوشیاری سے اس کے دِل میں ریشماں کے خلاف شبہات اُبھارنے لگی۔ ان کی ازدواجی زندگی میں

دراڑیں پڑنے لگیں۔ پھر ایک روز زرینہ نے عبداللہ سے کہا کہ وہ ریشماں کو رات کے وقت اپنے پاس بُلائے۔ عبداللہ نے ایسا ہی کیا۔ اُس نے ریشماں کو بتایا کہ اُس کے علاج کا اب آخری مرحلہ باقی رہ گیا ہے۔ اُسے رات کے وقت اُس کے گھر کی چھت پر چلّہ کاٹنا ہوگا۔ اس چلّے کے بعد اُس کی مُراد پوری ہو جائے گی۔ خاوند کی خوشنودی کے لئے ریشماں یہ بھی کرنے کو تیار ہوگئی۔ دوسری طرف زرینہ نے لطیف کو ہوشیار کر دیا اور کہا کہ اس کی بیوی اپنے یار کے گھر جا رہی ہے۔ اگر وہ اپنی عزّت بچانا چاہتا ہے تو بچالے۔

جب ریشماں عبداللہ کے گھر جانے کے لئے گاؤں سے روانہ ہوئی لطیف کھیتوں میں چھُپا بیٹھا تھا۔ اُس نے ریشماں کا پیچھا کیا اور نہر کے کنارے سرکنڈوں میں اُسے روک لیا۔ خاوند کی غضبناک صورت دیکھ کر ریشماں کے ہوش اُڑ گئے۔ لطیف کی آنکھوں پر شکوک کا پردہ تھا اور غصّے سے اس کی صُورت بگڑی ہوئی تھی۔

ظاہر ہے اُس نے ریشماں سے پوچھا ہوگا کہ وہ رات کہاں گزارنے جا رہی ہے، خوف زدہ ذہن سے کوئی جواب نہ بن پایا ہوگا۔ خاوند اپنی پاکدامن بیوی کو گھسیٹتا ہوا نہر پر لے آیا ہوگا۔۔۔۔ کمزور عورت نے ملتجیانہ نگاہوں سے غیظ و غضب سے بھرے شوہر کی طرف دیکھا ہوگا، اپنی معصوم بچیّوں پر نگاہ دوڑائی ہوگی۔۔۔۔ اور پھر مجازی خدا کا دھکا کھا کر نہر کے پانی میں منہ چھُپا لیا ہوگا۔

شاید ماں کے ڈوبنے کا منظر دیکھ کر بڑی لڑکی ڈر کر بھاگی تھی۔ اُس کے فراک کی دھجّی کنارے سے ہٹ کر ایک جھاڑی میں پھنسی ہوئی تھی۔ غیظ و غضب میں بھرا ہوا باپ معصوم بیٹی کے پیچھے لپکا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ سرکنڈوں میں چھُپ گئی ہو۔

اُس نے اُسے وہاں سے پکڑا تھا اور نہر کے کنارے پہنچ کر نہایت سنگدلی سے دونوں بچیّوں کو لہروں کے سپُرد کر دیا تھا۔۔۔۔ لیکن ابھی اس کے اندر بھڑکی ہوئی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ وہ عبداللہ سے بھی بدلہ چکانا چاہتا تھا۔ دوسرے روز وہ چھُپکے سے عبداللہ کے ڈیرے پر پہنچا تھا۔ وہاں زرینہ کے ساتھ ساتھ عبداللہ کے چیلے چانٹے بھی موجود تھے۔ زرینہ نے اُس کی طرف فاتحانہ نگاہوں سے دیکھا۔ ایک لمحے میں لطیف سب کچھ بھانپ گیا۔ اس کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی ایک ہی جھٹکے سے اُتر گئی۔ وہ اپنے اصل دشمن کا چہرہ بے نقاب دیکھ رہا تھا۔ وہ چیختا ہوا زرینہ پر جھپٹا لیکن عبداللہ کے آدمیوں نے اُسے راستے ہی میں دبوچ لیا۔ زرینہ نے فخریہ انداز میں اُسے بتایا کہ اُس نے اپنے بیوی بچوں کو ناحق قتل کیا ہے۔ لطیف نے دیوانوں کی طرح چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے اُسے پہلے تو زبردستی نشہ پلایا پھر سر پر لاٹھیاں مار مار کر ہلاک کر دیا تب عبداللہ کے آدمیوں نے لاش کو اٹھایا اور رات کی تاریکی میں ریلوے لائن پر ڈال آئے۔

خودکشی کی ایک عام سی واردات کے پیچھے ایک نہایت گھناؤنی سازش چھُپی ہوئی تھی۔ زرینہ، عبداللہ اور اُس کے دو آدمیوں پر مقدمہ چلا۔ چاروں کو چودہ چودہ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ پانچویں مجرم لطیف کو سزائے موت ہوئی تو بے جا نہ ہوگا۔ اس شخص کو مرنا ہی چاہیئے تھا اور ایسے ہی اذّیت ناک طریقے سے مرنا چاہیئے تھا جیسے وہ مرا۔ اُس نے بے گناہ بیوی اور معصوم بچوّں کو صفائی کا موقع دیئے بغیر موت کی سزا دے دی تھی۔۔۔۔۔ اب بھی کبھی کبھی مجھے ایک عورت کی جھلک یاد آجاتی ہے جو ایک چمکدار صبح کو، اپنے خوش و خرم بچوّں کو انگلی سے لگائے "رام پورہ" تھانے کے سامنے سے گزری تھی۔

سیتا، سیٹھ اور کامنی

جب سے میں نے سیارہ ڈائجسٹ میں اپنی یادداشتیں لکھنی شروع کی ہیں۔ کئی
یسے واقعات بھی یاد آرہے ہیں جو شاید ہمیشہ ہمیشہ میرے ذہن کے سرد خانوں میں پڑے
ہتے۔ مجھے کسی دانشور کا قول یاد آرہا ہے کہ ذہن ایک ایسی الماری کی طرح ہے جس
ں مختلف یادیں مختلف خانوں میں پڑی رہتی ہیں۔ جب ہم کسی واقعے کی یاد تازہ کرنے
لیے کوئی خانہ کھولتے ہیں تو اس مخصوص واقعے کے ساتھ ساتھ اور بھی بے شمار
قعات ہماری نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی آج کل کچھ ایسا
ا ہو رہا ہے۔ امرتسر کے گرد و نواح کے حوالے سے کئی خوابیدہ داستانیں انگڑائی
لے کر بیدار ہو گئیں ہیں اور مجھے خود پر حیرت ہو رہی ہے کہ ایک زمانے میں میں
ں قدر مصروف یا "بلال شاہ" کی زبانی مارا ماری کی زندگی گزارتا رہا ہوں۔ ان
قعات میں امرتسر ہی کی ایک اور کہانی پیش خدمت ہے۔

کار اور لڑکی

اُن دِنوں میں جنوبی علاقے کے تھانے میں تعینات تھا۔ ایک رات میں ابھی

گھر میں کھانا کھا کر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر کسی گاڑی کے رُکنے کی آواز آئی۔ اُن دنوں گاڑیاں شاذ و نادر ہی ہوتی تھیں۔ کسی گاڑی کی آمد پر میرا چونکنا لازم تھا حسبِ توقع ذرا دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سے مَیں سمجھ گیا کہ یہ کوئی عورت ہے۔ میری بیوی صحن میں تھی۔ میرے اُٹھنے سے پہلے ہی وہ دروازے پر پہنچ گئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک جواں سال لڑکی کھڑی نظر آئی۔

لڑکی اپنے لباس سے تعلیمیافتہ اور متمول خاندان سے لگتی تھی۔ اُس نے ایک خوبصورت چادر لپیٹ رکھی تھی اور اُس کے لمبے سیاہ بال شانوں پر بکھرے ہوتے تھے۔ میری بیوی نے دروازے سے ہٹ کر اُسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ صحن میں روشنی تھی۔ مَیں نے لڑکی کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اُس کی عمر بمشکل بیس بائیس سال ہوگی۔ روشن آنکھوں والی وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی لیکن مَیں پہلی نظر میں ہی بھانپ گیا کہ وہ کوئی گھمبیر مسئلہ لے کر میرے پاس آئی ہے۔ اندر داخل ہو کر اُس نے مجھے نمستے کیا۔ میری بیوی نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ ذرا جھجکتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مَیں نے اُس سے پوچھا۔

”بی بی کہاں سے آئی ہو“ اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی میری بیوی بولی۔

”یہ بیچاری صبح بھی آئی تھی مجھے آپ کو بتانا یاد نہیں رہا۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ یہ لوگ یہیں امرتسر میں رہتے ہیں۔“

”ہاں بی بی بتاؤ۔ کیا مسئلہ ہے تمہارا۔“ مَیں نے لڑکی سے پوچھا۔ جواب دینے کی بجائے اُس نے چادر کے پلّو سے آنسو پونچھنے شروع کر دیئے۔ میری بیوی میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اس کا والد لکڑی کا ایک بڑا تاجر ہے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ پچھلے

دنوں کچھ لوگوں نے اس کے والد کو اغوا کر لیا ہے۔

تب سارا واقعہ مجھے یاد آگیا۔ قریباً دس روز پہلے امرتسر کا ایک معروف کاروباری شخص کنہیا لال اغوا ہو گیا تھا۔ قبائلی علاقے کے کچھ لوگوں سے اس کا لین دین کا جھگڑا چل رہا تھا۔ وہی لوگ اُسے اُٹھا کر اپنے علاقے میں لے گئے تھے۔

واقعات کے مطابق چند روز پہلے کچھ پٹھان کنہیا لال کے پاس آئے تھے وہ دو دن امرتسر میں اس کے پاس رہے۔ بعد میں انہوں نے کہا کہ وُہ اُسے پشاور کے ایک شخص سے بھاری رقم سُود پر لے کر دے سکتے ہیں۔ کاروبار کی حالت ٹھیک کرنے کے لئے کنہیا لال کو رقم کی اشد ضرورت تھی۔ وُہ اُن کے چکمے میں آگیا۔ یوں وہ لوگ اُسے ورغلا کر لے گئے۔

کنہیا لال کے منیجر نے تھانے میں جو ابتدائی رپورٹ درج کروائی تھی اُس میں تین افراد گلریز خاں، حبیب گل اور خیاب گل کے نام درج کرائے گئے تھے۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ یہ لوگ کنہیا لال کو اُس کی گاڑی اور ڈرائیور سمیت اغوا کر کے لے گئے ہیں۔

پانچویں روز کنہیا لال کا ڈرائیور واپس امرتسر آگیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ سیٹھ صاحب کو وہ لوگ قبائلی علاقے میں لے گئے ہیں پہلے انہیں پشاور سے آگے کوہاٹ لے جایا گیا تھا۔ وہاں ایک دن رکھنے کے بعد وہ لوگ انہیں براستہ سڑک کرم ایجنسی میں لے گئے یہاں پہنچ کر ڈرائیور کو چھوڑ دیا گیا تاکہ وہ واپس پہنچ کر کنہیا لال کے لواحقین کو اطلاع دے سکے۔ انہوں نے سیٹھ کی واپسی کے لئے بیس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔ بیس لاکھ روپے ان دنوں بڑی رقم تھی اور اغوا کرنے والوں کے مطابق یہ رقم کنہیا لال کے ذمے واجب الادا تھی۔

اس سے پہلے ایک پولیس پارٹی صوبہ سرحد روانہ کی جا چکی تھی لیکن اس کی طرف

سے ابھی تک کوئی حوصلہ افزا رپورٹ نہیں ملی تھی۔ ابتدا میں ان لوگوں نے مقامی حکام کے ذریعے اغوا کرنے والوں سے کچھ بات چیت کی تھی لیکن اس بات چیت کے نتیجے میں حالات سلجھنے کی بجائے اور پیچیدہ ہو گئے تھے۔ یہ سارے کے سارے واقعات چند ثانیے میں میری نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے۔ مَیں نے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھی مغموم صورت لڑکی کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ میری نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے وہ بولی۔

"مَیں اُن کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میرے پتا کو آپ لوگ کب واپس لائیں گے۔ اُن کے سوا میرا اس دُنیا میں کوئی نہیں۔ مَیں اُن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

وہ پھر ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ مَیں نے اپنی بیوی سے کہا کہ ملازم کو چائے وغیرہ کا کہے۔ پھر میں لڑکی کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر جلد ہی اُس کے پتا کو چھڑا نہ لیا گیا تو وہ لوگ انہیں ہلاک کر دیں گے۔ اس کی باتوں سے مَیں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے باپ سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور اس کی جدائی بُری طرح محسوس کر رہی ہے۔ وہ برہمن خاندان کی ایک سلجھی ہوئی ذہین لڑکی تھی۔ لاہور گورنمنٹ کالج سے اس نے حال ہی میں بی اے کیا تھا۔ اس کی ماں فوت ہو چکی تھی اور اب اس کا سب کچھ اس کا باپ تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا نجانے لوگ مال و زر کے تعاقب میں اتنی دُور کیوں نکل جاتے ہیں کہ اُن کی عزیز ترین ہستیاں بھی ان کی صورت کو ترس جاتی ہیں۔

لڑکی کا نام شیلا تھا۔ وہ قریباً ایک گھنٹہ ہم میاں بیوی کے پاس بیٹھی رہی۔ وہ اس سے پہلے کیسوں کے سلسلے میں میرا نام سُن چکی تھی اور غائبانہ طور پر مجھ سے متاثر

نظر آتی تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ مجھے کوئی جناتی قسم کی چیز سمجھ رہی ہے کہ اُدھر مَیں نے اُس کی مدد کی ہامی بھری اور اُدھر اُس کا باپ دشمنوں کے چنگل سے آزاد ہو کر اُس کے سامنے آ موجود ہوا۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی "اگر مجھے کسی پر بھروسہ ہے تو وہ آپ ہیں۔ صرف اور صرف آپ ہی میرے پتا کو واپس لا سکتے ہیں۔" نجانے کس نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی۔ بہرحال میری اتنی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ مَیں اُس کے معصومانہ اعتبار کو ٹھیس پہنچا سکتا۔ یوں بھی یہ میرے علاقے کا کیس تھا۔ مَیں نے اس سے وعدہ کیا کہ مَیں اُس کے والد کی برآمدی کی پوری کوشش کروں گا۔"

ہندو وڈی ایس پی نئی مصیبت

اگلا دن مَیں نے ابتدائی تیاری میں گزارا۔ مَیں نے ایک تفتیشی پارٹی لے کر خود صوبہ سرحد جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ میرا مخبر بلال شاہ اس کیس میں خاصی سرگرمی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اُس کی غیر معمولی دلچسپی میرے لئے حیرت کا باعث تھی۔ لیکن جلد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ دراصل بلال شاہ، سیتا اور اُس کے پتا کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ کسی وقت سیٹھ کنہیالال کے لئے کام کرتا رہا تھا۔ اس کی اس قسم کی حرکتوں کا مجھے علم تھا۔ وہ پارٹ ٹائم "ریکوری مینیجر" کا کام بھی کرتا تھا۔ کسی نہ کسی کاروباری شخص کے ساتھ منسلک ہو کر وہ اُدھار وغیرہ کی قسطیں وصول کرتا تھا۔ اس کام کے عوض کبھی اُسے کچھ پیسے مل جاتے تھے اور کبھی صرف لڑائی جھگڑا ہی حصے میں آتا تھا۔ دراصل اُسی نے سیتا کو میرے بارے میں بتایا تھا اور اُسے یہاں بھیجا تھا۔

بہر حال اگلے دن میں تفتیشی پارٹی کے ساتھ بذریعہ ٹرین پشاور روانہ ہُوا۔ پشاور سے بس کے ذریعے ہم کوہاٹ پہنچے۔ پہلے آنے والی تفتیشی پارٹی کا انچارج انسپکٹر شجاع تھا۔ انسپکٹر شجاع کی کارکردگی خاصی ناقص رہی تھی پچھلے چار پانچ دن سے یہ لوگ سیر سپاٹے اور تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔

میں کوہاٹ پہنچتے ہی مقامی حکام سے ملا۔ کوئی ایک گھنٹے کے تبادلۂ خیال اور دوپہر کے کھانے کے بعد ہم "ٹل" شہر روانہ ہو گئے۔ ٹل میں اگلے روز دوپہر تک بھاگ دوڑ جاری رہی۔ تیسرے پہر ہم پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے اغوا کنندگان سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ لوگ سیٹھ کو "پارہ چنار" کے ایک نواحی گاؤں میں لے گئے تھے۔ مقامی پولیس نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا۔ ہم نے توقف اختیار کیا کہ تنازعہ حل کرنے کے لئے کنہیا لال کو مقامی پولیس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ ملزم پارٹی اس تجویز پر کسی صورت رضامند نہیں ہو رہی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ محبوس کو پولیس کی تحویل میں دینے سے پیشتر دوسری شرائط طے کی جائیں۔

ملزموں نے سیٹھ کے اغوا سے قبل خاصی منصوبہ بندی کی تھی۔ انہوں نے اپنے بال بچوں کو محفوظ مقام پر منتقل کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے دفاع کا بھی معقول انتظام کر رکھا تھا۔ دراصل سیٹھ کنہیا لال کے ذمے جو رقم تھی۔ اُس میں کئی افراد شریک تھے۔ اغوا کے بڑے تین ملزموں کا سیٹھ سے براہِ راست تعلق تھا۔ یہ تینوں افراد نہ صرف خود اُدھار پر بہت سی لکڑی کنہیا لال کو دے چکے تھے بلکہ کئی دوسرے لوگوں کی رقم بھی اس کام میں پھنسوا چکے تھے۔ اب یہ سب افراد جن کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ تھی۔ مقامی پولیس کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔ ایک مقامی مخبر نے اطلاع دی تھی کہ

ان لوگوں نے ایک قلعہ نما حویلی کے اندر مضبوط مورچہ بندی کر رکھی ہے۔ ہم نے کوشش کی کہ مقامی انگریز کمشنر اس معاملے میں مداخلت کرے۔

کمشنر یہ بات سمجھتا تھا کہ معاملہ نہایت گھمبیر ہے اور فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر سکتا ہے اس نے ذاتی طور پر مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی۔ اغوا کنندگان کے تین نمائندوں نے پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے مقامی حکام سے ملاقات کی سیٹھ کی نمائندگی اُس کے ایک بھائی اور مینجر نے کی۔ دو دن کی گفت و شنید کے بعد یہ باتیں طے پائیں۔ سیٹھ کنہیا لال چار لاکھ روپے فی الفور ادا کرے گا۔ باقی رقم دو دو لاکھ روپے کی قسطوں میں آٹھ ماہ کے اندر ادا کی جائے گی۔ اگر سیٹھ قسط کی ادائیگی میں تاخیر کرے گا تو اسے مقرّہ کردہ شرح کے مطابق ہرجانہ دینا ہو گا۔ سیٹھ کو کمشنر کی ذمہ داری پر رہا کیا جائے گا۔ اگر سیٹھ رقم دینے سے انکاری ہو گا تو مقامی حکام ہر طرح سے اس کے ذمے دار ہوں گے۔

تمام باتیں تقریباً طے پا چکی تھیں۔ لیکن ایک واقعے کی وجہ سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ مذاکرات میں شریک ہونے والے پولیس آفیسرز میں ایک ہندو ڈی ایس پی بھی شامل تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے قبائلی پٹھانوں سے کہہ دیا کہ تم لوگ یوں تو تسبیح پھیرتے رہتے ہو لیکن جب پیسے کی بات آئے تو دھرم وھرم سب بیچ دیتے ہو۔ پٹھانوں میں گلریز خاں نامی شخص نہایت جوشیلا تھا۔ اُس نے ہندو ڈی ایس پی کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس سے پہلے کہ دوسرے ارکان معاملے کو سنبھالتے ہندو ڈی ایس پی نے گلریز خاں کو تھپڑ مار دیا۔ گلریز خاں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر خنجر نکالا اور ڈی ایس پی پر حملہ آور ہو گیا۔ پلک جھپکنے میں مذاکرات کی میز میدان جنگ بن گئی۔ گلریز خاں کو تو پکڑ لیا گیا لیکن باقی دو قبائلی افرا تفری میں فرار ہو گئے۔

ہندو ڈی ایس پی کے شانے پر خنجر کا گہرا زخم آیا تھا۔ وہ بیہوش ہو گیا اور اُسے فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا۔۔۔۔۔ مذاکرات کامیابی کے قریب پہنچ کر بُری طرح ناکام ہو گئے تھے اب کنہیا لال کی زندگی خطرے میں تھی۔ عین ممکن تھا کہ قبائلی طیش میں آ کر اُسے ہلاک کر دیتے۔ میری نگاہوں میں اس کی معصوم بیٹی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس نے جس طرح مجھ پہ اعتماد کا اظہار کیا تھا اس کا تقاضہ تھا کہ مَیں فوری طور پر کچھ کروں۔ یہاں مذہب برادری یا قوم کا سوال نہیں تھا۔ ایک انسان کی زندگی خطرے میں تھی اور قانون کا محافظ ہونے کے ناطے میرا فرض تھا کہ اس کی جان بچانے کی کوشش کروں۔

ڈائریکٹ ایکشن

قبائلی فرار ہو گئے تھے اور براہِ راست کارروائی ضروری ہو چکی تھی۔ مَیں نے اپنے ساتھی آفیسرز سے مشورہ کیا اور فوری طور پر چھاپے کا منصوبہ بنایا۔ کچھ ساتھیوں کا خیال تھا کہ گل ریز خان پر سختی کر کے مفروروں کے ٹھکانے کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ لیکن میں گل ریز خان کے تیور دیکھ چکا تھا مجھے یقین تھا کہ اس شخص سے کچھ اگلوانے کی کوشش وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔ بہرحال ایس پی صاحب کے حکم کے مطابق گل ریز خان پر تھرڈ ڈگری استعمال کی گئی۔ دو گھنٹے میں وہ تین دفعہ بیہوش ہوا لیکن اس نے ہندو ڈی ایس پی کو گالیاں دینے کے سوا زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ مَیں نے بہت کم لوگوں کو اس قدر سخت جان دیکھا ہے۔

شام کو جب ہماری چھاپہ مار پارٹی روانہ ہونے والی تھی کمشنر کی طرف سے مقامی ایس پی کو خاص طور پر اس بات کی ہدایت کی گئی کہ وہ خود چھاپے کی قیادت

کریں۔ لہٰذا ایس پی کی نگرانی میں ہم عشاء سے کچھ دیر پہلے اس گاؤں کے نواح میں پہنچ گئے۔ جہاں سیٹھ کنہیا لال کو محبوس کیا گیا تھا۔ پولیس پارٹی نے ایسا راستہ اختیار کیا تھا جو عام آبادی سے ہٹ کر تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض چٹیل میدان تھا۔ دُور دُور تک چھپنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی تھی۔

مخبروں نے ملزموں کے ٹھکانے کی نشاندہی کی۔ گاؤں کی بیرونی حدود کے ساتھ ایک بہت بڑا مکان نظر آ رہا تھا۔ ایک بڑے احاطے کے گرد مٹی کی اُونچی دیوار بنائی گئی تھی۔ دیوار کا جو حصّہ نظر آ رہا تھا اس کے دونوں سروں پر دو اونچی برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایسی برجیاں ان علاقوں میں عام دیکھنے میں آتی تھیں۔ برجیوں پر پہریداروں کی موجودگی لازمی تھی۔ ایس پی صاحب نے مجھے ایک سپاہی کے ساتھ آگے بھیجا تاکہ میں مکان کا قریب سے جائزہ لے سکوں۔ میں سپاہی کے ساتھ رینگتا ہوا کوئی سو گز آگے گیا۔ وہاں سے برجیوں میں حرکت کرنے والے ہیولے صاف نظر آ رہے تھے۔ حویلی کے اکلوتے دروازے پر بھی مسلح افراد پہرہ دے رہے تھے لگتا تھا قبائلی حالات کو سمجھ رہے ہیں اور کسی بھی حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد ہیں۔

صورتِ حال حوصلہ شکن تھی۔ واپس جا کر مَیں نے ایس پی صاحب سے تمام ماجرا بیان کیا۔ براہِ راست کارروائی کے لئے صورتحال کسی طور بھی مناسب نہیں تھی۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ جس شخص کی جان بچانے کے لئے سب کچھ کیا جا رہا تھا۔ وہ مکان کے اندر موجود تھا۔ ایس پی صاحب سوچ میں ڈوب گئے۔ مَیں نے اپنی تجویز پیش کرنے کے لئے موقع مناسب جانا۔

مَیں نے کہا۔" ایس پی صاحب۔ اگر آپ اجازت دیں تو مَیں اکیلا حویلی کے

اندر گھسنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

مَیں نے انہیں بتایا کہ مَیں نے ایک چھوٹی سی برساتی نالی دیکھی ہے جو بالکل خشک ہے۔ مَیں اُس کے اندر گھستا ہوا حویلی کی بیرونی دیوار تک پہنچ سکتا ہوں۔ اس منصوبے میں خطرہ ضرور تھا لیکن چونکہ مَیں خود پیش کش کر رہا تھا۔ اس لئے ایس پی صاحب نے تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد اجازت دے دی۔ یہاں مَیں یہ بتا دوں کہ حویلی کے دوسری طرف سے "ریڈ" کرنے کا خیال اعلیٰ سطحی میٹنگ میں متفقہ طور پر ردّ کر دیا گیا تھا۔ چونکہ اس طرف آبادی تھی۔ اس لئے ملزموں کا ہوشیار ہو جانا یقینی تھا۔ اور ان کے ہوشیار ہونے کا مطلب تھا کنہیا لال کی موت۔

"اوہ مَیں مر گیا"

ایس پی صاحب نے ایک مقامی اے ایس آئی کو میرے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ کیا لیکن چونکہ وہ اچھی طرح اُردو نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی تفتیشی پارٹی کے سب سے سرگرم رکن یعنی "بلال شاہ" کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ بلال شاہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور اُس کی سرگرمی ماند پڑتی محسوس ہوئی لیکن پھر اُس نے خود کو تیار کر لیا۔ ہم دونوں تاریکی میں رینگتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ پروگرام یہ طے پایا تھا کہ حویلی کے اندر میں اکیلا جاؤں گا۔ اندر گھسنے کے بعد میں یہ کوشش کروں گا کہ انتہائی خاموشی سے سیٹھ کو لے کر احاطے کے اندر ہی کہیں روپوش ہو جاؤں۔

روپوش ہونے کی صورت میں مَیں ہوائی فائر کروں گا اور اس کے ساتھ ہی

چھاپہ مار پارٹی حرکت میں آجائے گی۔ اگر یہ صورت ممکن نہ ہوئی تو مَیں سیٹھ کے ساتھ حویلی سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔ اس صورت میں مَیں یکے بعد دیگرے تین فائر کروں گا۔ پولیس پارٹی پُوری شدت سے برجیوں پر فائر کھول دے گی اور مَیں سیٹھ کے ساتھ بھاگتا ہوا محفوظ دُوری تک پہنچ جاؤں گا۔

لیکن ان دونوں صورتوں کے علاوہ بھی بہت سی صورتیں ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھیں جس کے نتیجے میں ایس پی سمیت تمام افراد کے چہرے فکر مند دکھائی دے رہے تھے۔ بہرحال میں اپنے طور پہ فخر محسوس کر رہا تھا کہ مَیں ایک دوسرے صوبے کی پولیس کے سامنے پنجاب پولیس کی اچھی مثال پیش کر رہا ہوں۔ مَیں بلال شاہ کے ساتھ رینگتا ہوا برساتی نالی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔

وہاں سے حویلی کی بیرونی دیوار کوئی سو گز کے فاصلے پر تھی۔ برساتی نالے میں کہنیوں کے بل ہم نے اپنے صبر آزما سفر کا آغاز کیا۔ بلال شاہ ہانپ رہا تھا اور بار بار اپنا سر نکال کر حویلی کی طرف دیکھتا تھا۔ اب معلوم نہیں وہ راستے کی "طوالت" سے خوفزدہ تھا یا حویلی کی "قربت" سے نہایت احتیاط سے کھسکتے ہوئے ہم قریباً آدھ گھنٹے میں بیرونی دیوار تک پہنچ گئے۔ دیوار یہاں سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر تھی اور برجیاں ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ یہ بڑی اچھی بات تھی کہ حویلی کا مین گیٹ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مَیں نے بلال شاہ کا ہاتھ دبایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ پروگرام کے مطابق اب بلال شاہ کا کام اتنا تھا کہ میں اُس کے کندھوں پر پاؤں رکھ کے دیوار کے اُوپر چڑھ جاؤں۔ پھر بلال شاہ کو وہیں برساتی نالے کے اندر لیٹ کر کارروائی ختم ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ ناگزیر صورت حال ہی میں بلال شاہ کو مدد کے لئے بلاؤں گا۔ دیوار کے پاس پہنچ کر پتہ چلا کہ اُس کی اونچائی میرے اندازے سے زیادہ ہے۔ بہرحال قریب ہی ایک پتھر پڑا مل گیا۔ بلال شاہ اس کے اوپر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو سکتا تھا۔ میں بلال شاہ کے کندھے پر بیٹھا اور وہ گاڑی کے جیک کی طرح آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے کندھوں پر پاؤں رکھ کے مَیں بھی کھڑا ہو گیا۔ مَیں نے ہاتھ اوپر اُٹھایا لیکن بلال شاہ کی طویل قامتی کے باوجود دیوار کا کنارہ اب بھی ایک فٹ دُور تھا۔

بلال شاہ نے کہا "خان صاحب! میرے سر پر پاؤں رکھ لیں"۔

اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ جونہی مَیں نے بلال شاہ کے سر پر بوٹ جمائے اس کے منہ سے نکلا "اوہ مَیں مرگیا" تب مجھے یاد آیا کہ چند دن پہلے بلال غسل خانے میں پھسل گیا تھا اور اس کے سر پر تین ٹانکے لگے تھے۔

بہرحال اس وقت یہ سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ اتنا ہی خُدا کا شکر تھا کہ اُس کی لاؤڈ سپیکر جیسی آواز کسی نے سُنی نہیں تھی۔ میرا ہاتھ دیوار کی منڈیر پر پہنچ چکا تھا۔ اب اگلے قدم کے لئے مکمل خُدا پر بھروسہ کرنا تھا۔ دیوار کے اُوپر سے گزرتے ہوئے مَیں برجیوں پر سے نظر آسکتا تھا۔ بہرحال اللہ کا نام لے کر مَیں دیوار کے اوپر آیا اور اس پر لیٹ کر دوسری طرف لٹک گیا۔ مخبر کی اطلاع کے عین مطابق احاطے میں کئی جگہ لکڑی کے ڈھیر نظر آرہے تھے۔ مَیں زمین پر کُودا اور بھاگتا ہُوا لکڑی کے ایک ڈھیر میں چھُپ گیا۔

آثار بتا رہے تھے کہ مَیں پہرے داروں کی نظر سے محفوظ رہا ہوں۔ سانسیں درست کرنے کے بعد میں نے ریوالور نکالا اور آہستہ آہستہ احاطے کے آخر میں

واقع عمارت کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا قبائلیوں نے اپنی ساری توجہ حویلی سے باہر مرکوز کر رکھی ہے۔ عمارت کے سامنے ایک بڑا برآمدہ تھا۔ وہاں دو عمر رسیدہ شخص چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ شاید سو رہے تھے۔ مَیں دبے پاؤں اُن کے قریب سے گزر گیا۔ سامنے ایک کمرے میں لالٹین کی روشنی ہو رہی تھی۔ مَیں نے کھڑکی سے جھانکا اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں تو وہ کنہیا لال ہی تھا۔ وہ ایک چارپائی پر لیٹا تھا۔ مَیں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ اُس کے قریب ہی ایک نوجوان گود میں بندوق رکھے دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کام اتنا آسان ثابت ہو گا۔

مَیں نے کھڑکی میں آکر سیٹھ کو اپنی جھلک دکھائی۔ وہ پہلے تو بُری طرح چونکا پھر صورتحال بھانپ گیا۔ مَیں نے اُسے اشارہ کیا کہ وہ آہستہ آہستہ باہر آجائے۔ سیٹھ کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے خوف کے سائے لہرائے۔ پھر اُس نے خود پر قابو پایا اور دبے پاؤں چلتا ہُوا باہر آگیا ——— لیکن عین اس وقت اونگھتا ہُوا نوجوان بیدار ہو گیا۔ مَیں نے جب اُس کی طرف دیکھا وہ دو نالی بندوق کا رخ سیٹھ کنہیا لال کی طرف کر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ گولی چلانے ہی والا ہے۔ مَیں نے پستول کا رخ اس کی پیشانی کی طرف کیا۔ وہ بالکل نوجوان لڑکا تھا۔ مَس بھی پوری طرح نہیں بھیگی تھی ...... اس کے گلے میں تسبیح جھول رہی تھی۔ یہ سارا منظر سیکنڈ کے دسویں حصے میں میری آنکھوں کے سامنے کوندا۔ پستول کی نال خود بخود جھک گئی۔ مَیں نے اس کی پیشانی کی بجائے اس کے ہاتھوں کو نشانہ بنایا۔ دھماکہ ہُوا۔ بندوق اس کے ہاتھوں میں بُری طرح ڈگمگائی۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے اُسے چھاپ لیا۔ پستول

کا ایک بھرپور دستہ کھانے کے بعد وہ لہراتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

میرے فائر کے ساتھ ہی حویلی سے باہر دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں۔

پولیس پارٹی نے ہلہ بول دیا تھا۔ میں اور سیٹھ کمرے کے درمیان کھڑے تھے۔ یہ ایک خطرناک صورتِ حال تھی۔ میں سیٹھ کو لے کر بھاگتا ہوا باہر نکلا اور لکڑی کے ڈھیر میں چھپ گیا، لیکن یہ جگہ کسی صورت چھپنے کے لائق نہیں تھی۔ عین اس وقت میری آنکھوں کے سامنے تین چار آدمی بھاگتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں کچھ دیر پہلے سیٹھ موجود تھا۔ اُن کے ہاتھوں میں خنجر چمک رہے تھے۔ ذرا دیر بعد وہ غصے میں چلاتے ہوئے باہر نکلے اور صحن میں کچھ تلاش کرنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ وہ سیٹھ کی تلاش میں ہیں۔ اوپر سے ستم یہ ہوا کہ بھاگنے سے سیٹھ کنہیا لال کو کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ وہ کھانسی روکنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن لگتا تھا کہ اُس کا دم اُلٹ جائے گا۔ حویلی سے بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں اور قبائلی پولیس کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔ کھانسی کی شدت سے سیٹھ کا بُرا حال تھا۔ عین اُس وقت جب صحن میں سیٹھ کو تلاش کرنے والے ہمارے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ حویلی سے باہر دستی بموں کے دو دھماکے ہوئے اور پولیس دندناتی ہوئی بڑے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔

نیا چکر چل نکلا

سیٹھ کو چھڑا لیا گیا۔ گلریز خان کے علاوہ حبیب گل، خناب گل وغیرہ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ سیتا کو اس کا پتا مل گیا۔ اب دیوانی و فوجداری کا ایک طویل چکر تھا اور

اس کے بعد کوئی فیصلہ ہونا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ کیس ختم ہو چکا تھا لیکن میرے نزدیک کیس ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کچھ عرصہ پہلے بلال شاہ، سیٹھ کنہیا لال کے لئے رقوم کی وصولی کا کام کر چکا تھا۔ وہ سیٹھ کے بارے میں بہت سی اندرونی باتیں جانتا تھا۔ اُس نے سیٹھ کا جو نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچا تھا۔ وہ مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ بلال شاہ کے مطابق سیٹھ کاروباری ذہن کا ایک دیانتدار آدمی تھا۔ یوں بھی کچھ عرصہ پہلے تک اسے کوئی بُری عادت نہیں تھی۔ خرچ نام کو تھا آمدن بے شمار جو کماتا تھا وہ بینک بیلنس کا حصہ بن جاتا تھا۔ بلال شاہ کے مطابق ظاہراً اُسے کاروبار میں کسی قسم کا نقصان بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر کیا بات تھی جو وہ اتنا مقروض ہو گیا تھا۔ بلال شاہ کا خیال تھا کہ اس قرضے کے پیچھے کوئی ایسا راز ہے جس سے صرف سیٹھ اور اُس کی بیٹی ہی واقف ہیں۔

میں نے بعد کی ملاقاتوں میں سیتا کو کریدنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا۔ آخر ایک روز میں نے لڑکی سے کُھل کر بات کی۔ میں نے اُس سے کہا۔ "دیکھو سیتا! تم کہتی ہو کہ میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں اور تہہ دل سے آپ کی احسان مند ہوں۔ لیکن تم ابھی تک مجھے اصل بات بتانے سے گریز کر رہی ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں نے تمہارے پتا کی برآمدگی کے لئے کتنی محنت کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری تمام قربانی رائیگاں چلی جائے گی۔ اگر میں اس بات کا کھوج نہ لگا سکا جس نے تمہارے پتا کو کروڑپتی سے تقریباً دیوالیہ کر دیا ہے۔ جائیداد بک رہی ہے اور تم لوگوں کی مالی حالت دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ تمہیں معلوم ہے نہ کہ تمہارے پتا جی

بے تحاشہ شراب پینے لگے ہیں۔ وہ پہلے ہی دل کے مریض ہیں۔ اگر صُورتِ حال جُوں کی تُوں رہی تو بہت جلد۔۔۔۔ ۔لڑکی نے بے چین ہو کر میرے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میری جذباتی تقریر کا مقصد بھی یہی تھا۔ یہ میرے تھانے کا کیس تھا اور مَیں اس کی تمام گتھیاں سُلجھانا چاہتا تھا۔

سیتا نے رونا شروع کر دیا تھا اور مجھے پتہ تھا اب وہ دس منٹ سے پہلے خاموش نہیں ہو گی۔ مَیں صوفے پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ آخر وہ نارمل ہو گئی اُس نے کہا انسپکٹر صاحب (مَیں اِن لوگوں میں کافی گھل مل گیا تھا لیکن وہ مجھے انسپکٹر ہی کہتی تھی) مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ پچھلے ایک سال میں پتاجی بہت تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ پریشان رہتے ہیں۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجُود کثرت سے سگریٹ اور شراب پیتے ہیں لیکن اپنی پوری کوشش کے باوجُود میں انہیں سنبھالنے میں ناکام رہی ہوں۔ ایک وقت تھا جب وہ میری زبان سے نکلی ہوئی بات کو پورا کرنے کے لئے ہزاروں روپیہ لٹا دیتے تھے لیکن اب وہ بات بات پر مجھے جھڑک دیتے ہیں۔ گھر میں بھی اُن کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔۔۔۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتی۔

سیتا اس طرح ظاہر کر رہی تھی جیسے وہ اپنے پتا کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی اور یہ بات کافی حد تک درست بھی تھی لیکن میں اس کی آنکھوں میں شک کی ایک مبہم تحریر دیکھ چکا تھا۔ اور میرا اندازہ تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جسے وہ چھپا رہی ہے۔ شاید خاندانی عزت اور وقار اُس کے آڑے آ رہا ہے۔ وہ سمجھ رہی ہے کہ اس بات کے انکشاف سے اُس کے پتا کی آن پر حرف

آئے گا۔

بہر حال سیتا کی شفاف آنکھوں میں ابھی آنسو موجُود تھے اور مَیں سمجھ رہا تھا کہ لوہا ابھی ٹھنڈا نہیں ہُوا۔ مَیں نے ایک آخری ضرب لگاتے ہوئے کہا" اچھا ٹھیک ہے۔ سیتا ایک لاتعلق آدمی سے تم اپنے گھریلو حالات چھپانے کا حق رکھتی ہو۔ مجھے افسوس رہے گا کہ مَیں تمہارے اور تمہارے پتا کے کام نہ آ سکا۔ تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔ اچھا خُدا حافظ۔"

مَیں نے اپنی ٹوپی اُٹھائی اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ روکے گی۔ میں دروازے کے قریب پہنچا تو اُس کی آواز سنائی دی۔

"سُنیئے انسپکٹر صاحب"! مَیں نے مڑ کر دیکھا وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی اُس کے چہرے پر شدید ہیجان کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شاید کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ مَیں نے اس کے قریب پہنچ کر ملائمت سے کہا۔

"سیتا دیوی! مَیں تمہارا دشمن نہیں خیر خواہ ہوں۔"

اُس نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ کتنی ہی دیر وہ خالی نظروں سے قالین کو دیکھتی رہی پھر بولی" انسپکٹر صاحب مجھے شک ہے کہ پتاجی کے بدلے ہوئے رویّے اور ان کی پریشانیوں کی وجہ اُن کی پرائیویٹ سیکرٹری ہے۔ اُس کا نام کامنی ہے۔ وہ جوان اور خوبصورت ہونے کے علاوہ بے حد آزاد خیال بھی ہے۔ مجھے اُس کے چال چلن پر شبہ ہے۔ دفتر کے علاوہ وہ ہمارے گھر بھی آتی رہتی ہے۔ مَیں اُسے کئی دفعہ پتاجی سے تنہائی میں گفتگو کرتے دیکھ چکی ہوں۔ میرا خیال ہے اُس ذلیل نے پتاجی کو اپنے حُسن کے جال میں پھانس رکھا ہے۔" اُس نے یہ سب کچھ ایک

سانس میں اس طرح بتایا جیسے دل سے کوئی بڑا بوجھ اُتار دیا ہو۔ مَیں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا رہا۔ مَیں نے اسے یقین دلایا کہ اگر وہ تعاون کرتی رہی تو بہت جلد ہم معاملے کی تہہ تک پہنچ جائیں گے۔

کامنی مشکوک تھی

دوسرے روز میں نے اپنے ایک اے ایس آئی کو کامنی کے بارے میں چھان بین کرنے کے لئے کہا۔ اُس نے اسی روز شام کو مجھے رپورٹ دی۔ سیتا کے کہنے کے مطابق کامنی کی شہرت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ وہ شہر کے ایک فیشن ایبل علاقے میں اپنی ماں اور تین بہنوں کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ باپ فوت ہو چکا تھا۔ کوئی بھائی بھی نہیں تھا۔ اب وہی گھر کو چلا رہی تھی۔ یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ کامنی نے اپنی معاشی حالت کو سدھارنے کی غرض سے سیٹھ پر ڈورے ڈالے ہوں۔ اس روز میں سیتا سے ملنے گھر گیا۔ کوئی ایک گھنٹے کی مغز ماری کے بعد میں نے اُسے مجبُور کر لیا کہ کامنی کی آمد پر وہ چھُپ کر اپنے پِتا کے ساتھ اس کی باتیں سُنے۔

تیسرے روز سیتا نے مجھے فون کر کے بُلایا۔ اس نے بتایا کل رات کامنی آئی تھی۔ وہ پِتا کے ساتھ ان کے کمرے میں کوئی آدھ گھنٹہ موجود رہی پھر اُس نے جھجکتے ہوئے وہ باتیں بتائیں جو اُس نے دروازے سے کان لگا کر سنی تھیں۔ اس نے بتایا وہ پِتا سے کہہ رہی تھی۔ سب کچھ آپ کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ کنہیا صاحب! جوش کی بجائے ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچئے۔ آج رات اگر کوئی خاموشی سے شہر کی دیواروں پر آپ کی "نیک نامی" کے اشتہار لگا گیا تو کل کیا حیثیت رہے گی،

آپ کی دولت اور جائیداد کی سانس لینا دوبھر ہو جائے گا آپ کو۔ پھر شاید موت بھی آپ کے خاندانی وقار کو پناہ نہ دے سکے۔

سیتا نے چند فقرے اور بھی سُنے تھے لیکن اُن کا مطلب واضح نہیں تھا۔ بہرحال بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ سیٹھ کنہیا لال کو بلیک میل کیا جا رہا تھا۔ کسی جذباتی لمحے کی لرزش اُس کی زندگی کا روگ بن گئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کامنی سیٹھ کو خود سے شادی پر مجبُور کر رہی ہو۔ جس کی وجہ سے وہ اپنا ذہنی سکون گنوا بیٹھا ہو۔ مَیں نے سیتا کی طرف دیکھا اور مجھے احساس ہُوا کہ آج پہلی بار اپنے پِتا کے بارے میں اس کا رویّہ بدلا ہُوا نظر آ رہا ہے۔ اُس نے کہا۔

"جب کامنی پِتا سے ملنے کے بعد کمرے سے باہر نکلی تو مَیں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ مَیں نے اُسے سخت بُرا بھلا کہا۔ میں نے کہا تو عورت نہیں ڈائن ہے۔ ایک انسان کو برباد کر رہی ہے، ایک بیٹی سے اُس کا باپ چھین رہی ہے۔ اتنے میں پِتا جی بھی کمرے سے نکل آئے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے جھڑکیاں دینی شروع کر دیں بلکہ انہوں نے ..... انہوں نے مجھے تھپّڑ بھی مارا۔"

سیتا پھر سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ مزید دس منٹ ضائع کرنے کی بجائے مَیں نے اُٹھ جانا مناسب سمجھا۔

سہ پہر کے وقت میں تھانے میں بیٹھا اسی کیس پر سوچ و بچار کر رہا تھا۔ حالات اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ کامنی نامی یہ لڑکی سیٹھ کی کسی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُسے بلیک میل کر رہی ہے لیکن لڑکی پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری تھا کہ وہ اکیلی ہی یہ کھیل کھیل رہی ہے یا اُس کے ساتھ کچھ اور لوگ

بھی مصروف ہیں۔ میں سیتا سے کچھ اور معلومات بھی چاہتا تھا۔ میں نے اس کے گھر ٹیلیفون کیا۔ ایک نوکر نے بتایا کہ کل رات سیتا اور اس کے باپ میں پھر جھگڑا ہوا تھا۔ اور وہ گھر چھوڑ کر اپنی نانی کے ہاں چلی گئی ہے۔ معاملہ گمبھیر ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے فوری طور پر کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔

بلیک میلر

میں نے ایک اے ایس آئی کو بھیجا اور وہ نہایت خاموشی سے کامنی کو تھانے لے آیا۔ میں جانتا تھا یہ ایک خطرناک کام ہے اگر کامنی کے اور ساتھی بھی ہیں اور وہ تھانے میں آکر بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی تو بلیک میلر اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آزاد ہوں گے۔ میں نے پہلے تو کامنی سے نرمی سے پوچھ گچھ کی لیکن وہ ایک گھری لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ اُس نے کوئی کام کی بات نہیں بتائی۔

مجبوراً میں نے وہ انداز اختیار کیا جس کے بارے میں میرے ساتھی مذاقاً کہا کرتے تھے کہ نواز خان آنکھوں سے لوگوں کی جان نکال لیتا ہے۔ میرے کڑے تیور دیکھ کر وہ سہم گئی۔ میں نے اُسے بتایا کہ اُسے نہایت خاموشی سے تھانے میں لایا گیا ہے۔ اور اگر میں چاہوں تو وہ کبھی اس چار دیواری سے باہر کی دُنیا نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا رنگ ایکدم پیلا پڑ گیا۔ میں اس قسم کی دھمکی دینا نہیں چاہتا تھا لیکن فوری نتیجہ حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ وہ بُری طرح نروس ہو چکی تھی۔ چند منٹ میں اُس نے سب کچھ بتا دیا۔

اُس نے ایک بالکل نئی کہانی سنائی ـــ اس کہانی سے سیٹھ کنہیا لال کی

زندگی کے ایک بالکل دوسرے رُخ پر روشنی پڑتی تھی۔ کامنی کے مطابق سیتا اپنے کالج کے زمانے میں ایک حادثے سے دوچار ہوئی تھی۔ وہ لاہور میں اپنی ایک ہندو سہیلی کے بھائی اور اُس کے دوستوں کے ہاتھوں اپنی عزت گنوا بیٹھی تھی۔ یہ سب کچھ بڑے عجیب انداز سے ہوا تھا۔ سیتا اپنی سہیلی کے ہاں گئی لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھی اُس کا بھائی گھر میں تھا اُس نے سیتا کو انتظار کرنے کے لئے کہا اور کوئی نشہ آور مشروب پلا دیا۔ بعدازاں اپنے دوستوں کے ہمراہ اُس نے سیتا پر مجرمانہ حملے کئے۔ اس انسانیت سوز واقع کی تصویریں کھینچی گئیں۔ سیتا کی سہیلی بھی اس واقع میں برابر کی شریک تھی۔

دراصل یہ لوگ نہایت خطرناک قسم کے بلیک میلر تھے۔ تصویریں حاصل کرنے کے بعد انہوں نے سیتا کے والد سے رابطہ قائم کیا۔ وہ جانتے تھے کہ کنہیا لال اپنی بیٹی کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ اس کے بہتر مستقبل کے لئے ہر قسم کی قربانی دے گا۔ اُن کے اندازے سو فیصد درست نکلے۔ سیٹھ نے ان کا منہ بند رکھنے کے لئے بڑی بڑی رقوم دینی شروع کر دیں۔۔۔۔۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری تھا۔ اور شاید سیٹھ کی مکمل بربادی تک جاری رہنا تھا۔

میں حیرانی سے یہ روداد سُن رہا تھا۔ "لیکن مس کامنی! کیا سیتا کو اس بارے میں کچھ خبر نہیں؟" کامنی نے کہا۔

"انسپکٹر صاحب! سیتا کی بے خبری سے بلیک میلروں کی ہوشیاری ظاہر ہوتی ہے۔ وہ لوگ جانتے تھے اور میں بھی یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر وہ شرمناک تصویریں سیتا دیکھ لیتی تو ایک لمحے کے لئے بھی زندہ رہنا گوارا نہ کرتی۔ میں اس کے مزاج

سے اچھی طرح واقف ہوں۔ سیتا کے مرنے سے بلیک میلر اُس لاکھوں روپے
کی رقم سے محروم ہو جاتے جو وہ سیٹھ سے بٹور رہے ہیں۔ انہوں نے سیٹھ صاحب
کو سب کچھ بتا دیا ہے لیکن ان کی بیٹی کو کچھ نہیں بتایا۔ سیٹھ صاحب کو معلوم ہے کہ
سیتا کی یہ تصویریں مدہوشی یا بیہوشی کی کیفیت میں اُتاری گئی ہیں۔ شاید اب سیتا کے
ذہن میں اس واقع کی دھندلی سی تصویر بھی موجود نہ ہو لیکن اگر سیٹھ صاحب اُن کے
مطالبات ماننے سے انکار کریں گے تو اُن کی خاندانی عزت کا جنازہ تو نکلے گا ہی،
اُن کی بیٹی بھی جان پر کھیل جائے گی۔

میں نے کامنی سے پوچھا "تمہارے علاوہ اور کس کس کو اس بارے میں معلوم ہے؟"

وہ بولی "اس معاملے میں صرف میں ہی اُن کی رازدار ہوں۔ وہ بھی اس لئے کہ اُن
کی ہر قسم کی ڈاک کو پہلے میں کھولتی ہوں" کچھ دیر خاموش رہ کر بولی "انسپکٹر صاحب!
سیٹھ صاحب فطری طور پر ایک شریف النفس آدمی ہیں۔ وہ جس عذاب سے گزر
رہے ہیں وہ صرف میں جانتی ہوں۔ اسی لئے اُن کی دلجوئی کے لئے میں اُن کے
پاس آتی جاتی رہتی تھی۔ میں انہیں اپنے پتا سمان سمجھتی ہوں۔

ایس کی تصویریں

اس نئے موڑ کے بعد صورت حال کافی حد تک واضح ہو چکی تھی۔ میں نے سیٹھ
کنہیا لال کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ میں اس سے ملا وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ
بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ ایک بار تو مجھے بھی اس پر ترس آ گیا۔ خاندانی وقار کو بچانے کے لئے
اور بیٹی کے مستقبل کی خاطر وہ کس قدر مصائب برداشت کر رہا تھا۔ ایک طرف اُسے

قرض خواہ کھینچ رہے تھے اور دوسری طرف بلیک میلر۔ میں نے سیٹھ کو اس بات کا یقین
دلایا کہ اُس کی آن پر حرف نہیں آئے گا۔ جو باتیں راز ہیں وہ ہمیشہ راز رہیں گی۔ قبائلی
علاقے کی کارروائی کے دوران وہ میری صلاحیتوں کا معترف ہو چکا تھا۔ میری یقین دہانی
پر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اُس نے اُٹھ کر میرے پاؤں پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں نے شانوں سے تھام
کر اُسے اٹھا لیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تھوڑی دیر بعد کنہیا لال مجھے بلیک میلروں کے اس گروہ کے
بارے میں معلومات فراہم کر رہا تھا۔

بلیک میلروں کا گروہ دراصل چار دوستوں پر مشتمل تھا۔ ان کا سرغنہ ہائی کورٹ
کے ایک ریٹائرڈ جج کا ناخلف بیٹا تھا۔ کچھ لوگوں کو انہوں نے بلیک میلنگ کے ذریعے بھی
اپنے ساتھ شامل کر رکھا تھا۔ لاہور کی ہندو آبادی ماڈل ٹاؤن کے تھانے کے انچارج
کے ساتھ مل کر میں نے ایک ہفتے تک سرگرمی سے چھان بین کی۔ بلیک میلروں کے گرد
گھیرا مضبوط اور تنگ کرنے کے بعد ہم نے بھرپور کارروائی کا فیصلہ کیا۔ اگلے روز شہر کے
مختلف حصوں سے چار سرغنوں سمیت اٹھائیس افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔

ان میں سے آٹھ افراد کو چھان بین کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ جبکہ باقی بیس افراد کے خلاف
چالان کی تیاری شروع کر دی گئی۔ بڑی بڑی سفارشیں آئیں لیکن میں اعلیٰ افسروں کو
پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ کوئی سفارش قبول نہیں کی گئی۔ میں نے سیٹھ سے جو وعدہ کیا تھا اُسے
پورا کیا۔ سیتا کے معاملے کو بالکل حذف کر دیا گیا۔ یوں بھی ملزموں کے خلاف اتنا مواد اکٹھا
ہو چکا تھا کہ وہ قرار واقعی سزا سے بچ نہیں سکتے تھے۔ کئی گمشدہ مقدموں کی فائلیں حرکت
میں آ گئیں اور کئی حل طلب کیس اپنے انجام کو پہنچے۔ چار بڑے مجرموں میں سے دو قتل کے

مرتکب بھی ہو چکے تھے انہیں پھانسی کی سزا ہوئی۔ جبکہ دو مجرموں کو عمر قید اور شاید آٹھ کو دس دس سال قید ہوئی۔

اس کیس کے حوالے سے مجھے ایک واقعہ زندگی بھر نہیں بھولے گا۔ جس روز میں نے چھاپہ مارا اور ملزموں کو گرفتار کیا، اس سے اگلے روز میں مجرموں سے برآمد ہونے والی اشیاء کا معائنہ کر رہا تھا۔ ان میں ایک سفید لفافہ بھی تھا۔ جس پر ماڈل ٹاؤن تھانے کے محرر نے لکھ رکھا تھا "ایس کی تصویریں"۔

میں نے اسے کہا تھا کہ باقی تمام تصویروں میں سے یہ تصویریں اور نیگیٹوز علیحدہ لفافے میں ڈال دینا۔ یہ دراصل سیتا کی تصویریں تھیں۔ میں کسی کام سے اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ جب ایک منٹ بعد واپس آیا تو سیتا کمرے میں بیٹھی تھی اور لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ لیکن پھر مجھے محسوس ہوا کہ لڑکی نے ابھی لفافہ کھولا نہیں۔ میں نے اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی اور باتوں میں لگا کر لفافہ اس سے لے لیا۔ وہ کامنی کے بارے پوچھ رہی تھی۔ میں نے اس "پوچھ تاچھ" کے لئے پہلے سے تیاری کر رکھی تھی۔ جلد ہی میں اُسے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ کامنی کا اس معاملے میں کوئی ہاتھ نہیں ہے اور یہ کہ اس کے پتا کو کچھ کاروباری پریشانیاں تھیں۔ جو اب دُور ہو گئی ہیں۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ اس کے "پرانے پتا" اب اُسے واپس مل جائیں گے۔ سیتا کے رخصت ہونے کے بعد میں اُٹھا اور چلتا ہوا آتشدان کے قریب پہنچا۔ پھر میں نے بے پناہ نفرت سے لفافے کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آتشدان میں پھینک دیئے۔

اک مرلہ زمین

بات معمولی تھی لیکن بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی۔ بلال شاہ کے مکان کے ساتھ ہی رحیم بخش کی حویلی تھی۔ مکانوں کے درمیان ایک تھوڑی سی تکون نما جگہ خالی رہ گئی تھی۔ یہی کوئی ایک مرلہ رقبہ ہو گا۔ رحیم بخش اور بلال شاہ دونوں کو اس جگہ کی ملکیت کا دعویٰ تھا لیکن چونکہ دونوں ہمسایوں میں اچھے تعلقات تھے۔ اس لئے کافی عرصے سے یہ معاملہ دبا چلا آ رہا تھا۔ رحیم بخش گاؤں کا ایک کھاتا پیتا زمیندار تھا۔ بلال شاہ چونکہ تھانہ کچہری کو ٹھیک ٹھاک سمجھتا تھا۔ اس لئے اس کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا۔

رحیم بخش کی بیوی کا ذہنی توازن خراب تھا۔ پہلے بھی وہ کچھ کھوئی کھوئی رہتی تھی لیکن کچھ عرصے سے وہ بالکل ہی پاگل ہو گئی تھی۔ وہ عموماً "رام پورہ" کی گلیوں میں ننگے پاؤں گھومتی رہتی، کبھی ہوا میں ہاتھ نچا نچا کر باتیں کرتی اور کبھی بچوں کو ڈرانے کے لئے ان کے پیچھے بھاگتی۔ جو بات اُس کے ذہن میں ایک بار سما جاتی پھر مشکل ہی سے نکلتی تھی۔ آج کل اُس نے ایک نیا شغل اختیار کر رکھا تھا۔ روزانہ شام کے وقت مٹی کا ایک دیا لے کر گھر سے نکلتی اور اُس خالی جگہ میں جا کر بیٹھ جاتی۔ جو دونوں مکانوں کے درمیان واقع تھی۔ دیہاتی لوگ اس قسم کی باتوں کا اثر فوراً

قبول کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اس جگہ پر کسی بزرگ کا سایہ ہے اور "اللہ رکھی" کو اس جگہ دیا جلانے کی بشارت ہوئی ہے۔ بلال شاہ کو یہ بات سیدھی کلیجے میں لگتی تھی۔ وہ بڑی دیر سے اس جگہ کی آس لگائے بیٹھا تھا۔ ابھی تو صرف چند لوگ یہ بات کہہ رہے تھے لیکن بلال شاہ جانتا تھا کہ اگر یہ سلسلہ چلتا رہا تو کچھ دیر بعد لوگ اس جگہ کو باقاعدہ خانقاہ بنا لیں گے۔

اُس نے اس مسئلہ پر کھل کر رحیم بخش سے بات کی۔ گفتگو کے دوران اُن میں تلخ کلامی ہو گئی اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ رحیم بخش کے بڑے لڑکے نے بلال شاہ کو گالی نکالی اور اُس نے جواب میں ایک تھپڑ اُس کے منہ پر جڑ دیا۔ یہ ساری باتیں مجھے اپنے ایک سپاہی سے معلوم ہوئیں۔ اُس نے بتایا کہ ابھی چند لمحے پہلے میاں کریم بخش کی بیٹھک میں جھگڑا ہوا ہے۔ ابھی بات ہمارے منہ میں ہی تھی کہ بلال شاہ طوفان کی طرح تھانے میں داخل ہوا۔ وہ پاؤں پٹخ پٹخ کر رکھ رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اکیلا بلال شاہ نہیں دس پندرہ آدمی تھانے میں داخل ہو رہے ہیں۔ اُس کے گلے کا پھاٹک کھلا تھا اور وہ اُونچی آواز میں رحیم بخش کو کوس رہا تھا۔

"خان صاحب" وہ آتے ہی دھاڑا "یا تو آپ رحیم کو سمجھا لیں یا خُون خرابے کے لئے تیار ہو جائیں۔"

"کیا بات ہے پھر کسی سے لڑ کے آئے ہو؟" مَیں نے انجان بن کر پوچھا۔

"لڑائی تو اب ہو گی میرے سرکار۔" وہ کُرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "رحیم کو پتہ ہے تھڑے والی جگہ اُسے نہیں مل سکتی۔ وہ میری جگہ ہے سارے لوگ جانتے ہیں اب وہ میری جگہ کو خانقاہ بنانا چاہتا ہے لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ مَیں نے

بہت صبر کیا اب اور صبر نہیں کروں گا۔"

مَیں نے اُسے سمجھایا بجھایا اور ایک سپاہی کے ہاتھ رحیم کو بُلوا بھیجا۔ اُس کے تیور بھی بدلے ہوئے تھے اور وہ بلال شاہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ بیں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ اللہ رکھی "سائیں لوک" ہے وہ جو بھی کرتی ہے ہم ٹوکتے نہیں۔ اُس نے اپنی مرضی سے دیا جلانا شروع کیا ہے۔ ہم اُسے زبردستی نہیں روک سکتے۔ دوسری طرف بلال شاہ اپنی کہے جا رہا تھا۔ جب اُس نے رحیم کی بیوی کو دو تین بار سیدھا سیدھا پاگل کہا تو رحیم طیش میں آ گیا۔ دونوں اُٹھ کر دست و گریباں ہو گئے۔ مَیں نے بمشکل انہیں علیحدہ کیا۔ رات کوئی دس بجے تک مَیں اُن سے مغز کھپاتا رہا۔ دونوں کچھ نرم پڑ گئے۔ لیکن میں جانتا تھا دِلوں سے رنجش دُور نہیں ہوئی۔

مار کا رسیا

چار پانچ روز خیریت سے گزرے۔ ایک صبح کا ذکر ہے بلال شاہ میرے پاس بیٹھا تھا کہ اُس کا چودہ پندرہ سالہ لڑکا بھاگتا ہوا آیا۔ اُس نے بتایا کہ تھڑے والی جگہ پر کچھ آدمی اینٹیں لگا رہے ہیں۔ بلال شاہ تڑپ کر اُٹھا اور میرے روکتے روکتے باہر نکل گیا۔ اُس کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ اتنے سال کی رفاقت کے بعد مَیں اُس کا مزاج اچھی طرح سمجھتا تھا۔ چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ بھولا بھی تھا۔ لڑائی جھگڑے کے معاملے میں آؤ تاؤ نہیں دیکھتا تھا۔ بس جہاں لڑائی ہو گئی، ہو گئی۔ چاہے مقابلے میں آٹھ دس آدمی بھی ہوتے، بلال شاہ میدانِ جنگ میں کُود پڑتا۔ یہی وجہ تھی کہ

ہفتے میں ایک آدھ بار کہیں نہ کہیں سے اُس کی سکائی ہو جاتی تھی۔ لیکن مار کھانے کے بعد بھی وہ ٹلتا نہیں تھا۔ اور نہ ہی ڈرتا تھا۔ موقع پڑنے پر پھر حسبِ سابق تن تنہا مار کھانے کے لئے پہنچ جاتا تھا۔ بہرحال یہ تو چھوٹی موٹی لڑائیوں کی بات ہے اس وقت تک تو صورتحال خاصی تشویشناک تھی۔

مَیں نے فوراً موقع پر پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ جب مَیں بلال شاہ کے مکان کے سامنے پہنچا چند افراد ایک چارپائی کندھوں پر اُٹھائے بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ جب وہ قریب پہنچے تو مَیں نے اُن سے پُوچھا چارپائی پر کون ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بلال شاہ کو رحیم بخش کے بیٹے نے خنجر مار دیا ہے۔ ایک لمحے کے لئے میرا دماغ سُن ہو گیا۔ بلال شاہ اور میرا زیادہ سے زیادہ تین منٹ کا وقفہ پڑا تھا۔ اتنی دیر میں کس قدر سنگین واقعہ رونما ہو گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ چارپائی پر وہی بلال شاہ بے حس و حرکت لیٹا ہے جو چند لمحے پہلے مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

لوگ چارپائی لے کر بھاگتے ہوئے دور نکل گئے تھے۔ مَیں نے ایک اے ایس آئی کو اُن کی مدد کے لئے بھیجا۔ بلال شاہ کی بیوی اور دونوں لڑکیاں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی چیخ و پکار کر رہی تھیں۔ مَیں نے اُن کے پاس پہنچ کر دلاسا دیا۔ لوگوں نے بتایا کہ رحیم بخش کا لڑکا اپنے ایک ساتھی کے ساتھ کھیتوں کی طرف بھاگ گیا ہے۔ مَیں نے اے ایس آئی گوبندر کو ملزموں کے تعاقب میں بھیج دیا۔ بلال شاہ کے مکان کے ساتھ تکون نما جگہ پر چند اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ قریب ہی معمار کے اوزار پڑے تھے۔ لگتا تھا چند لمحے پہلے یہاں کچھ ہاتھا پائی ہوئی ہے۔ مَیں نے رحیم بخش کے دروازے پر دستک دی۔ تیسری چوتھی دستک پر وہ باہر نکلا۔ اُس نے اس واقع سے لاعلمی کا

اظہار کیا۔ مَیں اُسے لے کر تھانے آ گیا۔

پندرہ منٹ کے اندر اندر رحیم بخش کے آٹھ دس حمایتی تھانے میں پہنچ گئے۔ موقع کے گواہ بھی موجود تھے لیکن اُن میں سے زیادہ تر خاموش تھے۔ رحیم بخش کے ایک حمایتی نے بتایا کہ گاؤں کے کچھ لوگ اپنے طور پر وہاں اینٹیں لگا رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک چبوترا بنا دیا جائے تاکہ لوگ اس جگہ پیشاب وغیرہ نہ کریں۔ اتنے میں بلال آ گیا اور اینٹیں لگانے والے کو مارنے لگا۔ جب اُس نے میاں رحیم بخش اور اُن کے بیٹوں کو گالیاں دیں تو اُن کا بڑا بیٹا ہاشو آ گیا۔ بلال شاہ اور وہ گتھم گتھا ہو گئے۔ بلال شاہ نے چاقو نکال لیا۔ ہاشو نے خود کو بچانے کی کوشش کی۔ اسی کھینچا تانی میں چاقو بلال شاہ کو لگ گیا۔ یہ تو رحیم بخش کے حمایتی کا بیان تھا۔ لیکن بلال شاہ کے حمایتی کا بیان کیا تھا۔ مَیں نے اِدھر اُدھر نظر گھمائی لیکن کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو تصویر کا دُوسرا رُخ دکھاتے۔ ظاہر ہے رحیم بخش کے اثر و رسوخ کی وجہ سے گاؤں کے کسی باشندے کو اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ بلال شاہ کے حق میں بولتا۔ بیوی بچوں کے علاوہ اُس کا کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا۔

بہرحال بیان کے بغیر بھی میں صورتِ حال کو سمجھ رہا تھا۔ رحیم بخش نے اپنے کارندوں کے ذریعے چبوترے کا شاخسانہ چھیڑا تھا اور ظاہر یہی کیا تھا کہ یہ گاؤں والوں کا کام ہے بعد میں اس کے بیٹے نے حمایتیوں کے ساتھ مل کر بلال شاہ کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ مَیں اِس قسم کی صورتِ حال سے بارہا گزر چُکا تھا۔ دیہات کے چوہدری اور کھاتے پیتے لوگ اس طرح اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہیں کہ اُن کے جُرم کے خلاف گواہی ڈھونڈنے میں پولیس والوں کو دانتوں پسینہ آ جاتا ہے۔

جب پردہ اُٹھا...

بروقت طبی امداد ملنے سے بلال شاہ کی جان بچ گئی۔ کوئی بیس روز ہسپتال میں رہ کر وہ گاؤں واپس آگیا۔ چبوترے کی تعمیر میں نے اُسی دن رکوا دی تھی۔ بلال شاہ نے ہسپتال سے فارغ ہوتے ہی حق شُفعہ کا کیس کر دیا۔ میں نے دَرپردہ اُس کی جائز مدد میں کوئی گناہ نہیں سمجھا۔ آثار بتاتے تھے کہ فیصلہ اُس کے حق میں ہو جاتے گا۔

میرا گھر تھانے کے قریب ہی تھا۔ یہاں سے بلال شاہ کے گھر کا فاصلہ کوئی ایک فرلانگ تھا۔ ایک رات میری بیوی نے مجھے جھنجھوڑ کر اُٹھایا۔ ساتھ والی گلی سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے اپنے گھریلو ملازم کو صورتِ حال جاننے کے لئے بھیجا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ بلال شاہ کے ساتھ واپس آیا۔ بلال شاہ کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ کسی سے لڑ کر آیا ہے لیکن شاید میں یہ پہلی بار دیکھ رہا تھا کہ لڑائی کے باوجود اس کے زخمی ہونے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ سینہ پھلا پھلا کر چل رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ لڑائی میں اُس کا پلّہ بھاری رہا ہے۔ تفصیل بتاتے ہوئے بلال شاہ نے کہا۔

"آپ کو پتہ ہے جی، میں بڑا چوکنّا سوتا ہوں۔ ذرا کوئی آواز آئی اور میں جاگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دیوار کے پاس کسّی چلا رہا ہو۔ میں دَبے پاؤں چھت پر گیا تو نکڑ والی زمین پر تین آدمی کھدائی کر رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ رحیم دھوکے سے زمین پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ راتوں رات دیوار کھینچ کر اندرونی دیوار گرادیں گے اور پھر "سٹے آرڈر" لے کر بیٹھ جائیں گے، لیکن میں نے کوئی چوڑیاں تو نہیں پہن رکھیں۔ میں نے وہیں چھت کی منڈھیر سے دو اینٹیں اُکھاڑیں اور بلند

آواز سے کہا۔

اس کے بعد بلال شاہ نے واقعی اپنی آواز اتنی اُونچی کر لی کہ ساتھ والے کمرے میں سوئے ہوئے میرے دونوں بچے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ میں نے کہا "اگر ماں کا دودھ پیا ہے تو اب کرو کھدائی۔"

اِس کے بعد بلال شاہ نے ہاتھ چلا چلا کر اور آوازیں نکال نکال کر بتایا کہ کس طرح اُس نے اینٹیں پھینکیں اور کس طرح وہ "چور کے پُتّر" بھاگ گئے۔ بلال شاہ کی بات کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ رحیم بخش زبردستی قبضہ کر کے "سٹے آرڈر" لینے کی کوشش کر سکتا ہے لیکن وہ اتنے کچّے ہاتھ ڈالے گا اس کی مجھے اُمید نہیں تھی۔ اکیلے بلال شاہ کے للکارنے پر اُن کا بھاگ جانا عجیب سا لگتا ہے۔ ہو سکتا تھا رحیم بخش تصادم سے بچنا چاہتا ہو لیکن کچھ بھی تھا یہ معاملہ تھا پُراسرار۔ کچھ لوگ آدھی رات کے وقت متنازعہ زمین پر کھدائی کر رہے تھے۔ اُن کا کیا مقصد تھا۔ اگر وہ دیوار بنانا چاہتے تھے تو پھر بلال شاہ کی آمد پر بھاگ کیوں گئے؟ کیا اُن کا مقصد کچھ اور تھا؟ ہو سکتا ہے وہ کوئی چیز تلاش کر رہے ہوں۔ پھر اچانک میں نے ایک فیصلہ کیا۔ میں نے بلال شاہ نے کہا کہ مجھے ایک شک ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ایک روز کے لئے کہیں اور چلے جاؤ۔ وہ مُنہ پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا لیکن جلد ہی وہ میری بات سمجھ گیا۔

دو دن بعد بلال شاہ تمام گھر والوں کے ساتھ جالندھر میں کسی شادی کا بہانہ بنا کر چلا گیا۔ میں نے رات کے وقت ایک اے ایس آئی کو متنازعہ جگہ کی نگرانی پر لگا دیا۔ میرا خیال تھا ہو سکتا ہے بلال شاہ کی غیر موجودگی میں وہ لوگ پھر کُھدائی کی کوشش کریں۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ شاید وہ لوگ چوکنّے ہو گئے تھے۔ تقریباً ایک

ہفتے کا وقفہ دے کر مَیں نے ایک کوشش اور کی لیکن اس دفعہ بھی کُھدائی کرنے والوں سے آمنا سامنا نہیں ہو سکا۔ بہرحال اپنے طور پر کھدائی کرنے کا فیصلہ تو مَیں کر ہی چکا تھا۔ جونہی عدالت سے اجازت نامہ حاصل ہوا مَیں نے دو مزدور لگوا کر اس جگہ کی کھدائی شروع کر دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صرف تین ساڑھے تین فٹ کی گہرائی سے ہمیں دو لاشیں دستیاب ہوئیں۔ لاشیں دو نوجوانوں کی تھیں۔ جنہیں اُن کے لباس ہی میں دفنا دیا گیا تھا گلے سڑے جسموں سے ناقابلِ برداشت سڑانڈ اُٹھ رہی تھی۔ مرنے والوں کے چہرے مکمل طور پر ناقابلِ شناخت تھے۔ لاشوں کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں کوئی ڈیڑھ ماہ قبل دفن کیا گیا تھا۔

اس واقع کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ دُور دُور سے لاشیں دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ ناقابلِ برداشت بُو کی وجہ سے لاشوں کے نزدیک جانا دشوار محسوس ہوتا تھا۔ بہرحال فرض کی ادائیگی میں سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ مَیں نے قریب جا کر لاشوں کا معائنہ کیا۔ حتمی رائے تو پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد ہی قائم کی جا سکتی تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ دونوں افراد کو خنجروں کے وار کر کے ہلاک کیا گیا ہے۔ دونوں کے جسموں پر مقامی لباس یعنی دھوتی کُرتا موجود تھا۔ قاتلوں کی جلد بازی اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ دفناتے وقت انہوں نے مقتولین کی جیبیں بھی خالی نہیں کی تھیں۔ ایک نوجوان کی جیب سے بگلا مارکہ سگریٹ کا مُڑا تُڑا پیکٹ اور تین روپے کی ریزگاری برآمد ہوئی جبکہ دوسرے کی جیب سے پندرہ روپے کے کرنسی نوٹ۔ ایک چھوٹی سی شیشی اور لوہے کا ایک ٹوٹا ہوا اسپرنگ نکلا۔ مَیں نے تمام چیزیں قبضے میں لے کر لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لئے امرتسر روانہ کر دیا۔

خانقاہ وقار کا مسئلہ بن گئی

مقتولین سے برآمد ہونے والی تمام اشیاء میرے سامنے میز پر رکھی تھیں۔ اور مَیں اے ایس آئی گوبندر کے ساتھ اُن کا معائنہ کر رہا تھا۔ چھوٹی شیشی جسے میں عطر کی شیشی سمجھا تھا دراصل دانتوں پر لگانے والی دوائی تھی۔ ایسی دوائیاں عموماً بسوں میں بیچی جاتی ہیں۔ یہ شیشی غیر استعمال شدہ تھی اور اس بات کی طرف اشارہ کرتی تھی کہ دونوں نوجوان کسی دوسری جگہ سے سفر کرتے ہوتے یہاں آئے تھے۔ اس کے علاوہ لوہے کا اسپرنگ بھی ایک اہم سراغ ثابت ہو سکتا تھا لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کس چیز کا اسپرنگ ہے۔

مَیں نے ان لاشوں کے سلسلے میں رحیم بخش اور اُس کے دو بیٹوں کو شاملِ تفتیش کر لیا تھا۔ رحیم پر شک ہونا ایک یقینی بات تھی۔ اُس نے اس جگہ کو محفوظ کرنے کے لئے بہت جتن کئے تھے۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ بلال شاہ اس جگہ کو اپنے مکان میں شامل کرنا چاہتا ہے تو وہ ہوشیار ہو گیا۔ اُسے اور اس کے بیٹوں کو خطرہ تھا کہ بنیاد وغیرہ کی کُھدائی میں لاشیں ظاہر ہو سکتی ہیں۔ اس مصیبت سے بچنے کے لئے انہوں نے خالی جگہ پر پختہ چبوترا تعمیر کرنے کی کوشش کی۔ بلال شاہ کی مداخلت پر اُسے سنگدلی سے زخمی کیا گیا۔ بعد ازاں جب اُمید پیدا ہوئی کہ زمین بلال شاہ کو مل جائے گی تو رات کی تاریکی میں کھدائی کر کے لاشیں نکالنے کی کوشش کی گئی۔ یہ تمام باتیں رحیم بخش کے خلاف جاتی تھیں۔ بہرحال ایک تفتیشی افسر کی حیثیت سے مجھے ہر پہلو پر نظر رکھنا تھی۔ رحیم کا مؤقف تھا کہ اُس کے نزدیک یہ معاملہ صرف زمین کا تھا۔ اُسے کچھ معلوم نہیں تھا اس

کے نیچے کیا گل کھلا ہوا ہے اس کے بیٹے نے کہا۔

خان صاحب! بلال شاہ نے ہم پر بہتان باندھا کہ ہم اپنی ماں کے ذریعے اُس کی جگہ کو خانقاہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایسی بے ہودہ بات کو ہم کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ یہ ہمارے لئے عزّت اور وقار کا مسئلہ بن گیا۔ اگر ہم نے زمین حاصل کرنے کی کوشش کی تو صرف بلال شاہ کی ضد توڑنے کے لئے۔ اگر وہ بھلے مانسوں کی طرح بات کرتا تو ہو سکتا تھا ہم یہ ٹکڑا اُسے دے دیتے۔

مَیں نے بڑے لڑکے ہاشو کو گھورا وہ ابھی تک گم صُم بیٹھا تھا۔ مَیں نے اچانک سوال کیا۔ "تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ آدھی رات کو زمین کھودنے آئے تھے، کس لئے؟"

میری توقع کے برعکس ہاشو نے اس سوال کا جواب بڑے اعتماد سے دیا۔ اُس نے کہا "خان صاحب! ہم اس بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں کھدائی کرنے کون لوگ آئے تھے اور اُن کا ارادہ کیا تھا؟

صورتِ حال کافی اُلجھی ہوئی تھی۔ ہاشو کی بات کافی حد تک درست تھی۔ بلال شاہ کو اس بات کا اعتراف تھا کہ وہ کھدائی کرنے والوں کی شکلیں نہیں دیکھ سکا تھا۔ اُس نے انہیں چھت پر سے للکارا تھا تو وہ اُس کے نیچے آتے آتے غائب ہو گئے تھے۔ کیا وہ کوئی تیسری پارٹی تھی؟

رحیم بخش اور اُس کے بیٹوں نے پوچھ گچھ کے دوران اپنی پوزیشن کسی حد تک صاف کر دی تھی۔ جہاں تک مجھے معلوم تھا رحیم بخش کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا۔ اُس کا باپ کسی وقت گاؤں کی مسجد کا امام ہوا کرتا تھا۔ رحیم بخش اپنے باپ کی طرح امامت کے منصب پر فائز تو نہیں ہوا تھا لیکن مسجد سے اُس کا تعلق کسی نہ

کسی طرح قائم تھا۔ حالانکہ پابندی سے نماز نہیں پڑھتا تھا لیکن پکّے نمازی بھی کسی دینی مسئلے پر اُس سے اُلجھ نہیں سکتے تھے۔ دراصل وہ مسجد کے انتظام اور مذہبی کاموں میں اتنے جوش وخروش سے حصّہ لیتا تھا کہ لوگ تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اُس کے بیٹوں تک پہنچتے پہنچتے دینداری کا رنگ کافی پھیکا پڑ چکا تھا لیکن پھر بھی اُن میں کوئی ایسی بُرائی نہیں تھی جس کا ذکر خاص طور پر کیا جا سکے۔

لاشیں مل گئیں

اُس روز ابھی تھانے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ محرّر نے پوسٹ مارٹم کی ایک رپورٹ میرے سامنے رکھ دی۔ یہ کھدائی سے برآمد ہونے والی لاشوں کی رپورٹ تھی۔ رپورٹ کے مطابق دونوں نوجوانوں کی عمریں سترہ اٹھارہ سال کے درمیان تھیں۔ انہیں چالیس پینتالیس روز قبل ہلاک کیا گیا تھا۔ کسی تیز دھار آلے سے دونوں کے گلے کاٹ دیئے گئے تھے۔ جسم کے مختلف حصوں پر تشدد کے آثار بھی تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرنے سے قبل نوجوانوں نے جدوجہد کی ہے۔ ایک مقتول کے سر پر کسی وزنی چیز، لکڑی کی چوکور لٹھ یا اینٹ وغیرہ کی ضرب بھی لگائی گئی تھی۔

اینٹ کے لفظ پر مَیں چونک گیا۔ میرا دھیان غیرارادی طور پر بلال شاہ کی طرف چلا گیا تھا۔ بلال شاہ کو ہم کبھی کبھی مذاق سے "بلال اینٹ مار" بھی کہا کرتے تھے۔ لڑائی بھڑائی میں اُس کا سب سے بڑا ہتھیار اینٹ ہوتی تھی۔ لڑائی کے دوران اینٹ کے حصول کے لئے وہ بعض اوقات ایک ایک فرلانگ دُور نکل جاتا تھا۔ لیکن یہ نہیں کہ اینٹ دستیاب ہوتے ہی وہ اُسے مدِمقابل کے سر پر دے مارتا تھا۔ وہ

اس کا استعمال موقع محل کے مطابق کرتا تھا۔ بلال شاہ کے اس "فن" پر بات بھی ہو جائے گی۔ مَیں ذکر کر رہا تھا پوسٹ مارٹم رپورٹ کا۔ اینٹ کے لفظ نے میرے خیالات کا دھارا بلال شاہ کی طرف موڑ دیا۔

اگر رحیم بخش پر شک کیا جا سکتا تھا تو انہی وجوہات کی بنا پر بلال شاہ کو بھی مشکوک ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ کیا بلال شاہ ایسا جرم کر سکتا ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ میرا جواب نفی میں تھا لیکن میرے اندر کا پولیس آفیسر مجھے اس معاملے میں مزید سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ پاگل عورت کے دیا جلانے اور لوگوں کی آمدورفت پر بلال شاہ سخت پریشان ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس جگہ کو فوراً اپنے مکان میں شامل کرے۔ اُس کی بے صبری مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ پھر مجھے یاد ہے چبوترہ بنانے کی خبر پر وہ کس طرح تڑپ کر اُٹھا تھا۔ مَیں اس کی تیزی پر خود حیران رہ گیا تھا۔ اُس کی غیر معمولی احتیاط بھی اپنے اندر معنی رکھتی تھی۔ آدھی رات کے وقت جب کچھ افراد نے زمین کھودنے کی کوشش کی تھی۔ وہ فوراً باخبر ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا وہ کتنی دشواری سے ایک رات کے لئے کہیں جانے پر رضامند ہوا تھا۔ کچھ بھی تھا بلال شاہ کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ پولیس کا مخبر تھا' علاقے میں اُس کی بے شمار دُشمنیاں تھیں۔ مَیں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اے ایس آئی گوبندر کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے مَیں نے ہی بُلایا تھا۔ میں نے اُسے دانتوں والی دوائی کی شیشی دیتے ہوئے کہا۔

"اس پر "فقیری منجن" کا نام لکھا ہے۔ اگر پتہ بھی لکھا ہوتا تو ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ معلوم کرو فقیری منجن کون بنا رہا ہے اور کس جگہ

بنا رہا ہے۔"

اُس کے جانے کے بعد مَیں نے مقتول کی جیب سے برآمد ہونے والا اسپرنگ اُٹھایا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ میرے قریب ہی "رائفل مین" دلاور بیٹھا تھا۔ اُس نے عام سے لہجے میں کہا "خان صاحب یہ تو ۳۰۳ کا اسپرنگ ہے"۔ اس چھوٹے سے فقرے نے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔ مجھے یاد آگیا تھا کہ یہ اسپرنگ ۳۰۳ رائفل کی لبلبی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایسے لگتا تھا کہ مقتول نے اپنی خراب رائفل کہیں بننے کے لئے دی تھی۔ رائفل بنانے والے نے خراب اسپرنگ نکال کر مقتول کو دے دیا تھا جو اُس نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ تفتیش کے لئے کچھ مواد ہاتھ آ گیا تھا لیکن اگلا قدم اٹھانے سے پہلے مجھے گوبندر کا انتظار کرنا تھا۔

گوبندر اگلے روز شام کے وقت واپس آیا۔ وہ بُری طرح تھکا ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ "فقیری منجن" فیروزپور شہر کا ایک شخص بناتا ہے اور اُسے صرف فیروزپور بس اڈے پر فروخت کیا جاتا ہے۔ گوبندر نے میری توقع سے بڑھ کر کام کیا تھا۔ اس نے ضلع فیروزپور کے تمام تھانوں سے معلومات حاصل کی تھیں لیکن ڈیڑھ ماہ قبل ایک یا دو نوجوانوں کی گمشدگی کی رپورٹ کہیں درج نہیں کرائی گئی تھی۔ اب دو صورتیں ہو سکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ دونوں نوجوان جو ایک ہی گاؤں کے دکھائی دیتے تھے۔ فیروزپور کے باہر سے سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ یا پھر دونوں اپنے لواحقین کو بتا کر آئے تھے کہ وہ طویل عرصے تک گھر سے باہر رہیں گے۔ بہرحال تفتیش کا راستہ مسدود نہیں ہوا تھا۔ مَیں نے گوبندر کو ایک بار پھر فیروزپور بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ فیروزپور شہر میں بندوقیں وغیرہ ٹھیک کرنے کی تین چار دوکانیں ہوں گی۔ اردگرد کے قصبوں

میں بھی ایک ایک دو دو دکانیں ہوں گی۔

گوبندر اگلے روز روانہ ہوگیا۔ اس دفعہ وہ تین روز کے بعد واپس آیا۔ میں اُس وقت بلال شاہ کے ساتھ دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ بلال شاہ چونکہ مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل تھا۔ اس لئے میں نے گوبندر کو آنکھ کے اشارے سے بات کرنے سے روک دیا۔ بلال شاہ نے شاید اس بات کو نوٹ کر لیا وہ اُسی وقت اُٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ گوبندر کے چہرے پر کامیابی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اُس نے خوشخبری سنائی کہ مقتول نوجوان کا سراغ مل گیا ہے۔ وہ دونوں گنڈا سنگھ والا کے ایک نواحی گاؤں "شاہ پور" کے رہنے والے ہیں۔ گوبندر نے بتایا۔

"کل میں اسلحے کے کاریگروں کا سراغ لگاتا ہوا گنڈا سنگھ والا پہنچا۔ یہاں اس کام کی ایک مشہور دکان ہے۔ دکان کا مالک محمد علی نامی ایک شخص ہے۔ میں نے اُسے اسپرنگ دکھا کر بندوق کے بارے میں پوچھا۔ وہ اس پرزے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ڈیڑھ ماہ پہلے اُس نے اپنے اکلوتے لڑکے ظفر کو یہ اسپرنگ دے کر فیروز پور بھیجا تھا تاکہ وہ اس طرح کا نیا اسپرنگ لے آئے۔ وہ سارا دن انتظار کرتا رہا لیکن نہ تو لڑکا آیا اور نہ اسپرنگ۔ دوسرے روز پتہ چلا کہ ظفر کا ایک انتہائی قریبی دوست بھی گھر سے غائب ہے۔ اُس کا نام عنایت تھا۔ اور وہ فرنیچر کا کام کرتا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے دونوں دوست کسی دوسرے شہر جا کر کام کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ دراصل ظفر کا دل اپنے باپ کے کام میں نہیں لگتا تھا۔ یوں بھی کوئی ایک ماہ سے وہ سخت پریشان رہتا تھا۔ ایک دو بار اپنے باپ سے اُس کی جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ جب تین چار روز گزرنے کے باوجود دونوں دوست واپس نہیں آئے تو گھر والوں نے سمجھ لیا کہ وہ کسی دوسرے شہر کام کرنے چلے گئے ہیں۔"

گوبندر نے بتایا کہ اُس نے ابھی تک لڑکوں کے والدین کو اس حادثے کی اطلاع نہیں دی۔ بہرحال اُس نے انہیں یہ کہہ دیا تھا کہ یہاں آکر انہیں بیٹے کے بارے میں اہم اطلاع مل سکتی ہے۔ اب وہ لوگ شام کی گاڑی سے امرتسر پہنچ رہے تھے۔

غم زدہ والدین کو لڑکوں کی موت کی اطلاع دینا ایک انتہائی ناخوشگوار فریضہ تھا جو میں نے انجام دیا۔ ظفر کے والد کے ساتھ ساتھ اُس کی ماں بھی آئی تھی اُس کی دلخراش چیخوں نے ہر آنکھ کو اشکبار کر دیا۔ لڑکوں کو امانت کے طور پر مقامی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ قبریں کھود کر لاشیں والدین کے حوالے کر دی گئیں۔ اور وہ روتے پیٹتے گنڈا سنگھ والا واپس چلے گئے۔ تجہیز و تکفین میں دو دن لگنا ضروری تھے۔ تیسرے دن میں اے ایس آئی گوبندر کے ساتھ شاہ پور جا پہنچا۔

عورت کا اسرار

اب ہمیں اس بات کا سراغ لگانا تھا کہ دونوں بدنصیب دوست شاہ پور گاؤں سے فیروز پور اور پھر امرتسر سے ہوتے ہوئے "رام پورہ" کیسے پہنچ گئے۔ ابتدائی تفتیش کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ نہ تو رام پورے میں اُن کی کوئی رشتے داری تھی اور نہ ہی یاری دوستی۔ یہ بھی امکان نہیں تھا کہ وہ کام کاج کے سلسلے میں وہاں گئے ہوں گے۔ میں نے تین دن وہاں رُک کر تفتیش کی۔ مقتولین کے دوستوں سے ملا۔ اُن کی ذاتی چیزیں دیکھیں۔ ماضی کے بارے میں چھان بین کی۔ لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ صرف اس بات کا اندازہ ہوا کہ دونوں انتہائی گہرے دوست تھے اور دوسرے ہم عمروں سے زیادہ میل جول نہیں رکھتے تھے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ انہیں اغوا کر کے رام پورے پہنچایا

گیا ہو لیکن پھر میرا دھیان اُن کی جیبوں سے برآمد ہونیوالی اشیاء کی طرف چلا گیا۔ یقیناً یہ اغواء کا کیس نہیں تھا۔ لڑکے اپنی مرضی سے رام پورہ آئے تھے اور بعد میں جو کچھ بھی ہوا تھا بڑی جلدی میں ہوا تھا۔

مَیں مقتول ظفر کے گھر کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا لیکن دُکان دیکھنی باقی تھی۔ مَیں نے اُس کے والد سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ وہ مجھے گنڈا سنگھ والا کے بازار میں اپنی دکان پر لے گیا۔ دکان میں بندوقوں کے ٹوٹے پھوٹے دستے "بے کار پستول" لوہے کی زنگ آلود نالیاں اور نجانے کیا کچھ پڑا تھا۔ ایک میز کے پیچھے کُرسی رکھی تھی۔ کُرسی کے ساتھ ہی رقم رکھنے والا چھوٹا سیف پڑا تھا۔ مَیں ایک ایک چیز کا بغور معائنہ کر رہا تھا۔ کُرسی کے پیچھے دیوار کے ساتھ چکنائی کا ایک بڑا سا دھبّہ تھا۔ کُرسی پر بیٹھنے والے کا سَر مسلسل دیوار کے ساتھ لگنے سے یہ دھبّہ بنا تھا۔ مَیں نے غور سے دیکھا ایک دوسرا چھوٹا دھبّہ جو نسبتاً کم بلندی پر تھا۔ دائیں طرف نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ مقتول لڑکے کے سَر کا دھبّہ ہے۔ اس دھبّے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دکان پر بیٹھتے وقت کُرسی کو اصل جگہ سے دو فٹ دائیں جانب کھسکا لیتا تھا۔ بظاہر یہ ایک معمولی بات تھی لیکن مَیں کوئی گوشہ تاریک چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لڑکے کا باپ محمد علی مجھے بیٹھنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ مَیں نے کُرسی کو دو فٹ دائیں طرف کھسکایا اور بیٹھ گیا۔ یہاں سے مَیں نے دیکھا کہ دکان کے کونے سے ایک دو منزلہ مکان کی جھلک صاف دکھائی دینے لگی تھی۔ چھت پر خوبصورت جالی دار پردہ لگا تھا اور ایک عورت پردے پر جھکی ہوئی دکان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب اُس نے مجھے اپنی جانب دیکھتے پایا تو ٹھٹھک کر پیچھے ہٹ گئی۔ جالی میں سے اس کا ہیولا صاف نظر آ رہا تھا وہ ابھی تک چھت پر کھڑی

تھی۔ پھر وہ شاید نیچے اُتر گئی۔ مَیں محمد علی سے باتیں کر رہا تھا۔ لیکن میری نگاہیں تیزی سے مکان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دُوسری منزل کی ایک کھڑکی میں پیدا ہونے والی درز میری نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکی۔ کوئی بڑی احتیاط سے دکان کا جائزہ لے رہا تھا...... مَیں نے وہاں کے مکینوں سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد مَیں لے ایس آئی گو بندر کے ساتھ مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ وہی چھت والی عورت باہر نکلی اور میری وردی کی جھلک دیکھ کر زرد ہو گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں بالکل دیر نہ لگی کہ وہ رحیم بخش کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ چالیس پنتالیس سال کی عمر میں بھی صحت مند اور خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ یہ ایک لمبا قصّہ ہے کہ مَیں نے کس طرح اُسے اعتماد میں لیا۔ بہرحال دو گھنٹے کے اندر اندر اُس نے سب کچھ اُگل دیا۔ اُس نے بتایا کہ رحیم بخش اُس کی چھوٹی بہن کا خاوند ہے۔ وہ شروع ہی سے بڑا سخت مزاج ہے۔ خاندان کے تمام لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ اُس نے بھی صرف اُسی کے خوف سے اب تک اپنی زبان بند رکھی ہے۔ اُس نے کہانی یوں بیان کی۔

"قریباً چار ماہ پہلے رحیم بخش کی بڑی لڑکی فرخندہ میرے پاس رہنے کے لئے آئی۔ وہ یہاں کوئی ڈیڑھ مہینہ رہی۔ اِسی دوران سڑک پار کی دُکان پر بیٹھنے والے لڑکے سے اُس کی راہ رسم ہو گئی۔

مَیں تو یہ کہوں گی کہ یہ سب رحیم بخش کی بے جا سختیوں کا نتیجہ تھا جو وہ اپنے بال بچّوں پر کرتا آیا ہے۔ مَیں نے فرخندہ کو بہت سمجھایا کہ تیرا باپ بڑا سخت ہے وہ تجھے اس غلطی پر کبھی مُعاف نہیں کرے گا لیکن اُس بدنصیب کی قسمت میں شاید یہی لکھ

تھا۔ وہ باز نہیں آئی۔ ایک دِن رحیم بخش یہاں آیا تو اُسے شک ہوگیا۔ اُس نے مجھے سخت بُرا بھلا کہا اور لڑکی کو فوراً یہاں سے لے گیا۔ میرا خیال تھا کہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن وہ لڑکا کھوج لگا کر رام پورے پہنچ گیا۔ فرخندہ اُس سے چوری چھپے کھیتوں میں مِلی۔ گاؤں کے ایک شخص نے اُنہیں دیکھ لیا اور اُس کی خبر رحیم بخش کو دے دی۔ اُس نے لڑکی کو بے دردی سے مارا۔ جب مجھے اس کا پتہ چلا تو میں رام پُورے گئی۔ میں فرخندہ سے بھی ملی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ معاملہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ لڑکی ناسمجھ تھی یہی کوئی سولہ سال کی ہوگی۔ وہ کہتی تھی جان دے دے گی لیکن ظفر کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ اگر یہ شادی ہو جاتی تو کوئی بُرائی بھی نہیں تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ رحیم بخش یہ بات بھی سُننا گوارا نہیں کرے گا۔ سمجھداری یہی تھی کہ لڑکی کی فوراً کہیں شادی کر دی جائے۔ ہم نے ایک جگہ بات پکّی کی اور شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ شادی سے کوئی بیس دِن پہلے ظفر اپنے دوست کے ساتھ پھر رام پور پہنچ گیا۔ فرخندہ کو ایک کمرے میں بند رکھا گیا تھا اور رحیم بخش باہر چارپائی ڈال کر سویا ہوا تھا۔ آہٹ سے اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس نے دروازہ کھولا تو ظفر روشندان کے راستے کمرے میں اُتر چکا تھا۔ دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر رحیم آپے سے باہر ہوگیا۔ اُس نے اپنے تین خاص نوکروں کو کسی ایسے ہی واقع کے لئے حویلی کے اندر سُلا رکھا تھا۔ اُس نے آواز دی اور تینوں آدمی لاٹھیاں لے کر آگئے۔ شور سُن کر ظفر کا ساتھی بھی اندر آگیا تھا۔ میں اُس دن وہیں تھی۔ قتل و غارت کا وہ منظر مجھے ساری زندگی نہیں بھولے گا۔ دونوں لڑکوں نے معمولی مزاحمت کی‘ یوں بھی ابھی وہ بچّے ہی تھے۔ میں نے رحیم بخش کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ

انہیں جان سے نہ مارے لیکن اُس پر تو خون سوار تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ بھاگ جائے ورنہ وہ اُسے بھی مار دیں گے لیکن اُس بدنصیب کی قسمت میں یہی لکھا تھا‘‘ عورت پھر ایک آہ بھر کر خاموش ہوگئی۔ میں اور گوبند ہمہ تن گوش تھے۔

”پھر کیا ہوا؟“ میں نے پُوچھا۔

عورت نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ”فرخندہ نے باپ کی بندوق تھام لی اور کہا مجھے گولی مار دو۔ لیکن وہ سنگدل بولا‘ حرامزادی میں تیری ہڈیاں توڑ کر تجھے ماروں گا۔ اُس نے بندوق کا دستہ اس کے سر پہ مارا۔ میں آگے بڑھی لیکن دوسرا دستہ میرے سر پر پڑا۔ میں نے دھندلاتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ رحیم بخش کے تینوں نوکر لڑکوں کو دبوچے ہوئے اُن کے گلے پر خنجر پھیر رہے تھے۔ اور رحیم بخش اپنی بیٹی پہ بندوق کے دستے برسا رہا تھا اس کے بعد میں بے ہوش ہوگئی۔

مجھے دوسرے دن ہوش آیا۔ میں وہیں ایک کمرے میں بستر پر لیٹی تھی اور سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ رحیم بخش سرہانے کھڑا لال آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی آنکھیں تھیں جنہیں میں بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔ اور جنہیں دیکھ کر میرا خون خشک ہو جاتا تھا۔ رحیم بخش نے پھنکارتے ہوئے کہا اگر زبان سے ایک لفظ بھی نکالا تو ٹکڑے کر دوں گا۔ میں نے چُپ سادھ لی۔ محلّے کی عورتیں زمین پہ بیٹھی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے بتایا گیا کہ ..... مجھے بتایا گیا کہ فرخندہ آگ میں جھُلس کر فوت ہوگئی ہے۔ کل تندور میں روٹیاں پکاتے ہوئے اُس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔ مجھے سب معلُوم تھا۔ لیکن میں رو چلّا کر چپ ہو رہی ..... اپنی پاگل بہن کی طرح جو گم صُم بیٹھی تھی۔ مجھے پتہ نہیں تھا اُن لڑکوں کے ساتھ کیا بیتی اور انہیں کہاں غائب کیا گیا۔ نہ ہی مجھے اتنی ہمّت ہوئی کہ میں رحیم بخش

سے اس بارے میں پوچھوں۔ چند روز پہلے جب مجھے پتہ چلا کہ رحیم بخش کے مکان کے پاس سے دو لڑکوں کی لاشیں ملی ہیں تو میں سمجھ گئی۔ یہ وہی بدنصیب دوست ہیں"۔ عورت پھر آنکھوں پر دوپٹہ رکھ کر ہچکیاں لینے لگی۔

اور وہ پکڑا گیا ....

میں جب رحیم بخش کو گرفتار کرنے کے لئے اُس کے گھر پہنچا، اندر سے اُس کی آواز آ رہی تھی۔ شاید وہ کسی کو پیٹ رہا تھا۔ تب دروازہ کھلا اور نو دس سال کی ایک بچی چیختی ہوئی باہر بھاگی۔ رحیم بخش ہاتھ میں جوتا لئے اُس کے پیچھے نمودار ہوا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ "کھیل ختم ہو گیا، رحیم بخش اپنے قدموں کو روک لو۔ تم تو مذہب کے ٹھیکیدار بنتے تھے رحیم۔ مجھے نہیں معلوم تھا تم مذہب سے اتنے دُور ہو" میری آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ "خدا اور رسول نے بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کا حکم نہیں دیا لیکن تم ایسا کرتے ہو۔ اُن کو کنوؤں میں دھکے دیتے ہو اور کہتے ہو پاؤں پھسل گیا۔ اُن پر فائر کرتے ہو اور کہتے ہو بندوق صاف کرتے ہوئے گولی چل گئی۔ ان پر پٹرول چھڑکتے ہو اور کہتے ہو روٹیاں پکاتے ہوئے آگ لگ گئی۔ میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں رحیم بخش"

رحیم بخش کا رنگ بالکل سفید پڑ گیا۔ جوتی اُس کے ہاتھ سے گر گئی۔ میرا بہت کچھ بولنے کو دل چاہتا تھا لیکن خود پر ضبط کیا۔ پستول کا ٹھوکا دیتے ہوئے میں نے اُسے دروازے کی طرف دھکیلا۔ اے ایس آئی گوبند اُس کے دونوں بیٹوں کو گرفتار کر چکا تھا۔ تھانے کے دروازے کے عین سامنے پہنچ کر رحیم بخش بُری

طرح ڈگمگایا۔ میں نے اُسے سہارا دیا۔ اُس کی آنکھیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ اُسے دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ ہسپتال پہنچنے سے پہلے پہلے وہ دم توڑ گیا۔ ایک لحاظ سے اُس کے حق میں اچھا ہی ہوا۔ وہ پھانسی پانے کی ذلت سے بچ گیا۔ اُس کا بڑا بیٹا قصور وار پایا گیا اور کوئی ڈیڑھ سال بعد تختہ دار پر لٹک گیا۔ رحیم بخش کے ایک نوکر کو بھی موت کی سزا ہو گئی۔

اس کیس کی ایک دلچسپ بات بلال شاہ کا روٹھنا تھا۔ اُسے اس بات کا سخت دُکھ ہوا تھا کہ میں نے اُس کی موجودگی میں گوبند سنگھ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اُس پر شک کیا تھا۔ وہ بیوی سے لڑ کے شملے چلا گیا۔ اُس کی بیوی مجھ سے پیسے لے کر گھر کا خرچ چلاتی رہی۔ بالآخر میں نے گوبند سنگھ کو بھیجا۔ اُس نے ایک کامیاب "چھاپہ" مار کر اُسے شملے کی مال روڈ سے پکڑ لیا....... وہ وہاں خشک خرمانیاں اور کاغذی بادام بیچ رہا تھا.....

سنہرے خواب

برساتی نالے میں پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ بلال شاہ ابھی چار پانچ قدم ہی اندر گیا تھا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا۔ ہمارے منہ کھُلے کے کھُلے رہ گئے۔ لیکن پھر خوش قسمتی سے وہ سنبھل گیا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ دونوں سپاہی زور زور سے ہنسنے لگے۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اُس نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ نالے کو بآسانی پار کیا جا سکتا ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ سپاہی محمد حسین اُس کی باتوں میں آ کر گھوڑا پانی میں ڈال دے گا۔ لیکن وہ بھی ایک کائیاں تھا۔ اُس نے کہا تھا شاہ صاحب آپ تو اس علاقے کے کیڑے ہیں۔ یہاں کی اُونچ نیچ سے آپ سے زیادہ واقف کون ہوگا۔ بلال شاہ جوش میں آ کر گھوڑے سے اُترا تھا لیکن نالے میں اُترتے ہی اُسے ہوش آگئی تھی۔ اب وہ بڑے اطمینان سے گھاس پر بیٹھا اپنی جُوتی میں سے پانی نکال رہا تھا۔ میرے ساتھ دونوں سپاہی بھی گھوڑوں سے اُتر آئے تھے۔ گھوڑوں کو نزدیکی درخت سے باندھ کر وہ بلال شاہ کے پاس جا بیٹھے۔ مَیں نے بُوٹ اور پیٹی کھول دی اور ایک درخت سے ٹیک لگا کر آرام کرنے لگا۔

کل صُبح امرتسر سے ایک قاصد کے ہاتھ ایس پی صاحب نے مجھے خط بھیجا تھا۔

اس خط میں انہوں نے علاقے کے ایک با اثر جاگیردار چوہدری سنگرام کی کچھ مشکلات بیان کی تھیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ بوٹا سنگھ نام کا ایک مفرور مجرم جاگیردار کی اکلوتی لڑکی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ اُسے دو بار اُٹھانے کی کوشش کر چکا ہے تاحال وہ اُن لوگوں کو دھمکیاں دے رہا ہے۔ چوہدری سنگرام ایس پی کا دوست تھا۔ اس لئے ایس پی صاحب نے خاص طور پہ مجھے جاگیردار کے ہاں بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا "نواز خاں: میری نظر میں اس کام کے لئے تم سے بہتر کوئی آدمی نہیں مجھے معلوم ہے تمہارے جانے سے کچھ عرصے کے لئے رام پورہ تھانے کی کارکردگی پر اثر پڑے گا لیکن جو کام میں تمہیں سونپ رہا ہوں یہ بھی بہت اہم ہے۔ تم اپنے ساتھ دس پندرہ یا جتنے بھی آدمی چاہو لے جا سکتے ہو لیکن جاگیردار کی کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر بوٹا سنگھ حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو اُسے بچ کر نہیں جانا چاہیئے۔"

مَیں نے جیب تھپک کر خط کی موجودگی کا اندازہ لگایا، ایک نظر نالے کی طرف دیکھا اور آنکھیں مُوند کر لیٹ گیا۔ مجھے معلوم تھا دو تین گھنٹے سے پیشتر نالہ ہمیں اپنے اندر سے گزرنے کی اجازت نہیں دے گا۔

جب مَیں اُٹھا گھڑی تین بجے کا وقت دکھا رہی تھی۔ میں اپنے اندازے کے عین مطابق ڈھائی گھنٹے سویا تھا۔ دونوں سپاہی اور بلال شاہ ابھی تک بے خبر سوتے ہوئے تھے۔ میں نے نالے کی طرف دیکھا۔ پانی کافی حد تک اُتر چکا تھا لیکن بادل جو بارش رکنے کے بعد چھٹ گئے تھے اب پھر گھر گھر کر آنے لگے تھے۔ میں نے بلال شاہ اور دونوں سپاہیوں کو جگایا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نالہ پار کر کے گھوڑے بھگاتے ہوئے جاگیردار کے گاؤں "رُوپ نگر" کے راستے پر جا رہے تھے۔ ایس پی صاحب

کے خط کے مطابق آج رات پھر بوٹا سنگھ کی آمد کا خطرہ تھا مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ مَیں شام سے پہلے رُوپ نگر پہنچ جاؤں۔ ہم نے کافی کوشش کی لیکن رُوپ نگر سے کوئی دس کوس اِدھر ہی ہمیں اندھیرا پڑ گیا۔ جس وقت ہم رُوپ نگر پہنچے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بارش اور کیچڑ کی وجہ سے ہمارا اور گھوڑوں کا بُرا حال تھا۔ جاگیردار کی بلند و بالا حویلی کے سامنے چند افراد ملے۔ اُن کے ہاتھوں میں بندوقیں اور برچھیاں تھیں اور وہ تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں کچھ ہو چکا ہے۔ ہم نے ایک آدمی کے ہاتھ اندر اطلاع بھجوائی۔ تھوڑی دیر بعد ایک لمبا تڑنگا شخص باہر نکلا۔ عُمر کوئی پچیس چھبیس سال کی ہوگی۔

"آؤ بادشاہو" اُس نے مجھے دیکھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا "بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔"

وہ حُلیے سے دیہاتی لیکن لب و لہجہ سے پڑھا لکھا شخص دکھائی دیتا تھا۔ ہمیں ساتھ لے کر وہ حویلی میں داخل ہوا۔ حویلی کے در و دیوار جاگیردار کی امارت کی گواہی دے رہے تھے۔ مَیں نے اتنے ٹھاٹھ باٹھ کی بہت کم حویلیاں دیکھی ہیں۔ ہمیں لے کر وہ نوجوان ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں صوفوں کے اُوپر کئی آدمی بیٹھے تھے۔ فرش پر قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر بندوقیں کلہاڑیاں وغیرہ لٹکی ہوئی تھیں۔ جنگلی جانوروں کے حنوط شدہ سر بھی نظر آ رہے تھے۔ سامنے دیوار پر شاید کسی چیتے کی کھال آویزاں تھی۔ اِس کھال کے عین نیچے مزین کُرسی پر جاگیردار سنگرام بیٹھا تھا۔ دو آدمی اُس کے قدموں میں بیٹھے تھے۔ ایک کالا بھجنگ پہلوان نما شخص اُس کے پیچھے برچھی تھامے مؤدب کھڑا تھا۔ دونوں سپاہی اور بلال شاہ باہر ٹھہر گئے تھے۔ میں اندر داخل ہوا۔ میرے

ساتھ آنے والا نوجوان میرے بُوٹوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بُوٹ کیچڑ میں لتھڑے ہوتے تھے۔ میں اِس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ شاید مجھے بُوٹ اتارنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ میں نے تسموں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ جاگیردار کرسی سے اُٹھ کر تیزی سے میری طرف بڑھا۔

"کیا کرتے ہو جناب" اُس نے خوشدلی سے میرا بازو تھامتے ہوئے کہا "تم تو ہمارے حاکم ہو۔ کھلے دِل سے اندر آؤ"

اس نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور مجھے صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے جاگیردار سے صورتِ حال کے بارے میں پُوچھا۔ وہی لمبا تڑنگا نوجوان پھر بولا۔

"آپ بالکل وقت پر آتے ہیں جناب۔ ڈاکوؤں کو بھگا دیا ہے ہم نے ..... آپ کے لئے ہم نے حلوہ تیار کر کے رکھا ہوا ہے۔ آپ حلوہ کھائیں اور آرام سے سو جائیں۔"

اُس کے لہجے کا طنز اتنا نمایاں تھا کہ کمرے میں موجُود کئی افراد مسکرانے لگے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں ایسا جواب دیتا کہ صاحب بہادر کے ہوش ٹھکانے آجاتے لیکن اُس وقت میں صبر کے گھُونٹ پی گیا۔ میں نے جاگیردار کو بتایا کہ راستے میں ڈیک نالے کی طغیانی کی وجہ سے ہم وقت پہ نہ پہنچ سکے۔ جاگیردار سنگرام ایک بھلا شخص دکھائی دیتا تھا۔ اتنی بڑی جاگیر کا مالک ہونے کے باوجُود اس میں نخوت اور نخرہ نہیں تھا۔ اُس نے میرا نام پُوچھا اور پھر "نواز" کہہ کر باتیں کرتا رہا۔ اُس نے بتایا کہ کوئی ایک گھنٹہ پہلے ڈاکوؤں نے دھمکی کے مطابق گاؤں پر حملہ کیا تھا لیکن ہم نے انہیں گاؤں کے باہر ہی سے مار بھگایا۔ ایک دیہاتی گولی لگنے سے معمولی زخمی ہوا تھا۔

اگلے روز میں نے جاگیردار سے اکیلے میں بات کی۔ اُس نے بتایا کہ بُوٹا سنگھ کا قصّہ چند ماہ پُرانا ہے۔ ایک روز اُس کی لڑکی جمنا سہیلیوں کے ساتھ باغ میں گئی تو وہاں سے بُوٹا اپنے ساتھیوں کے ساتھ گزرا۔ انہوں نے لڑکیوں سے بدتمیزی کی تو جمنا نے انہیں بُرا بھلا کہا۔ بوٹا سنگھ نے بدزبانی کی اور جمنا نے اُسے تھپّڑ کھینچ مارا۔ اتنے میں گاؤں کے آدمی پہنچ گئے اور بوٹا ساتھیوں کے ساتھ فرار ہو گ
جاگیردار ایک باپ کے انداز سے بتا رہا تھا اور میں ایک پولیس والے کے انداز سے سوچ رہا تھا۔ بوٹا سنگھ لڑکی کا حُسن دیکھ کر اُس پر عاشق ہو گیا ہو گا۔ اُس نے اُسے اُٹھانے کی کوشش کی ہو گی لیکن کامیاب نہیں ہوا ہو گا۔ بہرحال کچھ بھی تھا مجھے جاگیردا سنگرام کی حویلی کی حفاظت کا فرض سونپا گیا تھا اور یہ فرض مجھے ہر قیمت پر ادا کرنا تھا۔

میں نے جاگیردار کی اجازت سے حویلی کے اندرونی حصوں کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ حویلی کی عمارت دو منزلہ تھی۔ کمرے بڑے بڑے تھے۔ اُن کی آرائش سے اندازہ ہوتا تھا کہ حویلی کے مکین زیادہ نہیں تو کچھ پڑھے لکھے ضرور ہیں۔ خاص طور پر جاگیردار کا کمرہ بالکل شہری انداز سے سجا ہوا تھا۔ اُس کے پلنگ کے پاس چند کتابیں بھی دھری تھیں۔ عمارت کے عقب میں چار دیواری کے اندر زمین کا ایک کافی بڑا قطعہ خالی پڑا تھا۔ شاید مکینوں کی خواہش یہاں تالاب وغیرہ بنانے کی ہو لیکن پھر اتنے "ماڈرن پن" کی انہیں ہمت نہ ہوئی ہو۔ بائیں طرف ایک قطار میں ملازموں کی کوٹھڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ عمارت کے سامنے والے حصّے میں ایک چھوٹا سا مندر اور مندر کے ساتھ ایک باغ تھا۔ اس کے بعد میں نے حویلی کے محل وقوع کا جائزہ لیا۔ بیرونی حد بندی دیکھی اور اپنے دونوں رائفل بردار سپاہیوں کو نگرانی پر لگا دیا۔

دو تین دن گزر گئے کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ اپنے لئے میں نے حویلی کا سامنے والا حصّہ منتخب کیا تھا۔ حویلی کے گیٹ کے قریب ہی میرے لئے کمرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں کمرے کے باہر کرسی ڈلوا کر بیٹھ جاتا اور ہلال شاہ سے گپ شپ لڑاتا رہتا۔ بلال شاہ فالتو یا کہہ لیجیے کہ "ریلو کٹا" تھا۔ کبھی وہ میرے پاس آ بیٹھتا اور کبھی سپاہیوں کی طرف چلا جاتا۔ ایک روز شام کے وقت وہ میرے پاس آیا تو کہنے لگا۔

"خان صاحب! اُدھر بائیں نکڑ میں کچھ گڑبڑ ہے۔ محمد حسین کا خیال ہے کوئی آدمی باغ میں چھپا ہوا ہے۔"

میں نے بلال شاہ کو واپس بھیج دیا اور خود چہل قدمی کے انداز میں چلتا ہوا باغ کی طرف گیا۔ شام ہو چکی تھی اور آہستہ آہستہ اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ ایک نوکرانی سر پر ایک بڑا تھال رکھے حویلی کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ شاید تندور سے روٹیاں لگوا کر آئی تھی۔ میں اُسے نظر انداز کرتا ہوا باغ میں داخل ہو گیا۔ باغ میں اندھیرا زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ مالٹے اور سنگترے کے پودوں میں سے گزرتا ہوا میں مندر کی جانب گیا۔ ایک جگہ پتھر کے بنچ پر وہی لمبا تڑنگا نوجوان بیٹھا تھا۔ اب میں اس کے بارے میں اچھی طرح جان چکا تھا۔ اس کا نام منوج تھا۔ یہ جاگیردار کا بھتیجا تھا۔ تھوڑا بہت پڑھا ہوا بھی تھا۔ جاگیردار کے ہاں اس کا کافی آنا جانا تھا لیکن اِس وقت وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ لڑکی کی عمر بیس بائیس سال کی ہو گی۔ اُس نے کڑھائی والا ریشمی لاچا اور قمیض پہن رکھی تھی گلے میں ہار اور ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ اُسے دیکھتے ہی میری نظر سب سے پہلے اُس کی ناک پر اٹک گئی۔ اُس نے ناک میں بڑی خوبصورت

نتھنی پہن رکھی تھی۔ مجموعی طور پر لڑکی خوبصورت تھی۔ میں اُسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ جاگیردار کی بیٹی جمنا تھی۔ اِسی پر بوٹا سنگھ عاشق ہوا تھا۔ میں نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

"منوج باؤ! یہ آپ ہیں؟ میں نے سمجھا پتہ نہیں کون ہے۔"

میں واپسی کے لئے مُڑا۔ اتنے میں منوج کی آواز آئی "بادشاہو! اپنے کام سے کام رکھو۔ آپ کی ڈیوٹی رات کو ہے۔ رات کو سونے سے بہتر ہے کہ دن میں سو لیا کریں۔

مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔ لڑکی کی موجودگی میں سخت بات کہنی میں نے مناسب نہیں سمجھی۔

"باؤ منوج" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "مجھے جو ذمہ داری لگائی گئی ہے اُس میں رات اور دِن کی شرط نہیں ہے۔"

"ذمّے داری کیا ذمّے داری؟" منوج آگ بگولا ہو گیا۔ لڑکی بھی کڑی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ "ہم لوگ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ہمیں تمہاری سرکاری بندوقوں کی ضرورت نہیں۔" پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا "جمنا! تایا جان نے خواہ مخواہ کا خرچہ کیا ہے۔ ان لوگوں پر۔ کرائے کے ہاتھوں نے بھی کبھی کسی کی حفاظت کی ہے۔"

"صاحب بہادر تم حد سے بڑھ رہے ہو۔" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

اتنے میں جمنا بڑے ناز و انداز سے اُٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ تنگ قمیض میں اُس کا بدن پھٹ پڑنے کو بے قرار تھا۔ میرے سامنے پہنچ کر اُس نے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے۔ نصف آستین میں اس کے خمیدہ بازو بڑے پُرکشش دکھائی دے رہے تھے۔ اَب اِس کی آنکھوں میں تلخی کی جگہ شوخی نظر آ رہی تھی۔ بڑی ملائمت سے بولی۔

"جناب تھانیدار صاحب! لڑائی جھگڑا چھوڑ دیں۔ اِدھر ذرا روشنی میں بیٹھ کر اپنی پستول صاف کر لیں۔ مَیں نے سُنا ہے اکثر عین موقع پر آپ لوگوں کی بندوقیں فیل ہو جاتی ہیں ـــ اور ہاں، ذرا گیٹ کا دھیان رکھیئے گا۔ میری سہیلیاں بُلانے آئیں تو مجھے بتا دیں۔"

مَیں نے جبڑے بھینچ کر اپنے غصّے کو قابو میں کیا اور لڑکی کو دیکھتا ہوا واپس مُڑ گیا۔ میری توقع کے مطابق وہ دونوں میرے پیچھے ہنسنے سے بھی باز نہیں آتے۔ اِن لوگوں کا پالا نہ جانے کیسے پولیس افسروں سے پڑتا رہا تھا۔ مالک تو مالک گھر کے ملازمین بھی پولیس والوں کو فالتو سی چیز سمجھتے تھے۔ پہلے منوج اور اب لڑکی کے رویّے سے مجھے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ اس قسم کی باتیں سن کر پی جانا میری سرشت میں نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی جو مَیں اب تک خاموش تھا۔ بہرحال مَیں نے جاگیردار سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ملازم کے ہاتھ پیغام بھیجا۔ جاگیردار نے تھوڑی دیر بعد مجھے اندر بُلا لیا۔ مَیں نے جاگیردار سے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ انہیں حویلی میں ہماری ضرورت ہے یا نہیں۔ جاگیردار میرے تیوروں سے بھانپ گیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"نواز خاں! جو بات ہے کھُل کر بتاؤ۔ مَیں نے خود ایس پی صاحب سے کہہ کر تمہیں یہاں بلوایا ہے۔"

مَیں نے بلا توقف انہیں منوج کی بدتمیزی کے بارے میں بتا دیا۔ میری پُوری بات سُن کر جاگیردار بولا۔

"نواز میاں! ایس پی صاحب نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ تم ایک جرأت مند اور ذہین پولیس افسر ہو ـــ وہ تو بچے ہیں۔ اُن کی باتوں کا

غصّہ کرنے کی ضرورت نہیں۔" پھر اُس نے حُقّے کا ایک طویل کش لیا اور تکیے ـ
ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ "نواز پُتر! مَیں ایک بڑی اُلجھن میں گرفتار ہوں۔ بوٹا س
کی دُشمنی اتنی معمولی سی بات نہیں جتنی منوج وغیرہ سمجھتے ہیں۔ منوج تو ابھی کل ک
پیدائش ہے۔ یوں بھی نوجوان ہوش سے زیادہ جوش سے کام لیتے ہیں۔ تمہیں
معلوم ہی ہو گا بوٹا کوئی معمولی بدمُعاش نہیں۔ بے شمار ڈاکے اور قتل اُس کے کھا
میں ہیں۔ یوں بھی ایک مفرور قاتل سے بڑے سے بڑے جُرم کی توقع کی جا سکتی
جمنا جوان اور خوبصورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ جلد از جلد اُس کی شادی کر دوں۔"

"آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے" مَیں نے ہنکارا بھرا۔

"لیکن اس میں ایک دشواری ہے" جاگیردار اپنی گھریلو باتیں بتانے پر آمادہ
آ رہا تھا۔ "جمنا کی سورگ باسی ماں کی خواہش تھی کہ اُس کی شادی اپنے منہ بولے بھائی کی ط
کرے۔ یہ خواہش اتنی شدید تھی کہ کوئی اُسے ٹالنے کی جرأت نہ کر سکا لیکن مسئلہ
کہ مرنے والی کے بھائی کا صرف ایک ہی لڑکا تھا اور اُس کی عُمر جمنا کے مقابلے
بہت تھوڑی تھی۔ آج سے تین سال پہلے وہ شاید دوسری جماعت میں تھا۔ مَیں نے
کی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ پُرانے خیال کی روایت پسند عورت تھی۔ اُس
کہا کہ عمروں کے فرق کی کوئی بات نہیں۔ بہرحال اُس نے منہ بولے بھائی کے بیٹے سے اُس
نسبت طے کر دی۔ اس واقعے کے ایک سال بعد وہ بھگوان کو پیاری ہو گئی۔ اب
لڑکا گیارہ سال کا ہے۔ اگر ہم جمنا کی شادی اُس سے کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کم از کم چھ س
سال اور انتظار کرنا ہو گا۔ دوسری طرف جمنا کی عمر اکیس بائیس سال ہے۔ ایک آدھ
میں اُس کی شادی ہو جانی چاہیئے۔ اب یہ بوٹا سنگھ کا مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا ہے۔ میر

"جناب تھانیدار صاحب! لڑائی جھگڑا چھوڑ دیں۔ ادھر ذرا روشنی میں بیٹھ کر اپنی پستول صاف کر لیں۔ مَیں نے سُنا ہے اکثر عین موقع پر آپ لوگوں کی بندوقیں فیل ہو جاتی ہیں ۔۔۔ اور ہاں، ذرا اگیٹ کا دھیان رکھئے گا۔ میری سہیلیاں بُلانے آئیں تو مجھے بتا دیں۔"

مَیں نے جبڑے بھینچ کر اپنے غصّے کو قابو میں کیا اور لڑکی کو دیکھتا ہوا واپس مُڑ گیا۔ میری توقع کے مطابق وہ دونوں میرے پیچھے ہنسنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ان لوگوں کا پالا نہ جانے کیسے پولیس افسروں سے پڑتا رہا تھا۔ مالک تو مالک گھر کے ملازمین بھی پولیس والوں کو فالتو سی چیز سمجھتے تھے۔ پہلے منوج اور اب لڑکی کے رویّے سے مجھے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ اس قسم کی باتیں سن کر پی جانا میری سرشت میں نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی جو مَیں اب تک خاموش تھا۔ بہر حال مَیں نے جاگیردار سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ملازم کے ہاتھ پیغام بھیجا۔ جاگیردار نے تھوڑی دیر بعد مجھے اندر بُلا لیا۔ مَیں نے جاگیردار سے دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ انہیں حویلی میں ہماری ضرورت ہے یا نہیں۔ جاگیردار میرے تیوروں سے بھانپ گیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"نواز خاں! جو بات ہے کُھل کر بتاؤ۔ مَیں نے خود ایس پی صاحب سے کہہ کر تمہیں یہاں بلوایا ہے۔"

مَیں نے بلا توقف انہیں منوج کی بدتمیزی کے بارے میں بتا دیا۔ میری پُوری بات سُن کر جاگیردار بولا۔

"نواز میاں! ایس پی صاحب نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ تم ایک جرأت مند اور ذہین پولیس افسر ہو ۔۔۔ وہ تو بچے ہیں۔ اُن کی باتوں کا

غصّہ کرنے کی ضرورت نہیں۔" پھر اُس نے حُقّے کا ایک طویل کش لیا اور تکیے سے ٹیک لگاتے ہوتے بولا۔ "نواز پُتر! مَیں ایک بڑی اُلجھن میں گرفتار ہوں۔ بوٹا سنگھ کی دُشمنی اتنی معمولی سی بات نہیں جتنی منوج وغیرہ سمجھتے ہیں۔ منوج تو ابھی کل کی پیدائش ہے۔ یوں بھی نوجوان ہوش سے زیادہ جوش سے کام لیتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہی ہو گا بوٹا کوئی معمولی بدمُعاش نہیں۔ بے شمار ڈاکے اور قتل اُس کے کھاتے میں ہیں۔ یوں بھی ایک مفرور قاتل سے بڑے سے بڑے جُرم کی توقع کی جا سکتی ہے جمنا جوان اور خوبصورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ جلد از جلد اُس کی شادی کر دوں۔"

"آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے" مَیں نے ہنکارا بھرا۔

"لیکن اس میں ایک دشواری ہے" جاگیردار اپنی گھریلو باتیں بتانے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ "جمنا کی سورگ باسی ماں کی خواہش تھی کہ اُس کی شادی اپنے منہ بولے بھائی کی طرف کرے۔ یہ خواہش اتنی شدید تھی کہ کوئی اُسے ٹالنے کی جرأت نہ کر سکا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مرنے والی کے بھائی کا صرف ایک ہی لڑکا تھا اور اُس کی عُمر جمنا کے مقابلے میں بہت تھوڑی تھی۔ آج سے تین سال پہلے وہ شاید دوسری جماعت میں تھا۔ مَیں نے جمنا کی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ پُرانے خیال کی روایت پسند عورت تھی۔ اُس نے کہا کہ عمروں کے فرق کی کوئی بات نہیں۔ بہر حال اُس نے منہ بولے بھائی کے بیٹے سے اُس کی نسبت طے کر دی۔ اس واقعے کے ایک سال بعد وہ بھگوان کو پیاری ہو گئی۔ اب وہ لڑکا گیارہ سال کا ہے۔ اگر ہم جمنا کی شادی اُس سے کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کم از کم چھ سات سال اور انتظار کرنا ہو گا۔ دوسری طرف جمنا کی عمر اکیس بائیس سال ہے۔ ایک آدھ سال میں اُس کی شادی ہو جانی چاہئیے۔ اب یہ بوٹا سنگھ کا مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا ہے۔ میری

تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر جمنا کا ہاتھ کسی اور کو تھماتا ہوں تو مرنے والی کی رُوح کو تکلیف پہنچے گی۔ اگر مرنے والی کا عہد نبھاتا ہوں تو لڑکی کی عُمر نکل جائے گی۔

فکروں میں گھرا ہوا جاگیردار بالکل عام آدمی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اُس نے حُقّے کا طویل کش لیا اور تکیے سے ٹیک لگا کر چھت گھُورنے لگا۔ مَیں باغ میں جمنا اور منوج کو جس انداز میں دیکھ چکا تھا میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے جاگیردار کو ٹٹولنے کے لئے کہا۔

"جاگیردار صاحب! بدلے ہوتے حالات میں انسان کو بعض فیصلے بدلنے پڑتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اگر جاگیردارنی زندہ ہوتیں تو موجودہ حالات میں بھی وہ جمنا کے جلد بیاہ کا سوچتیں۔ ..... یہ آپ کا گھریلو معاملہ ہے۔ میری دخل اندازی مناسب تو نہیں لیکن آپ نے بات کی ہے تو مَیں اتنا مشورہ ضرور دوں گا کہ جمنا کی شادی ہو جانی چاہیے۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی اچھا لڑکا ہے تو جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔

جاگیردار نے پُرسوچ انداز میں کہا "ہاں لڑکا تو ہے ..... منوج کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟" پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی کہا "مسئلہ پھر وہی مرنے والی کا آجاتا ہے اُسے کیا جواب دوں گا آگے جا کر۔"

میں جاگیردار کے لکیروں بھرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ آج وہ مجھے پہلے سے زیادہ بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ شاید ان دنوں وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آج وہ پھر اپنے گھر کے پچھواڑے تالاب کھودنے کے متعلق سوچ رہا ہے۔ تالاب کے لئے اُس نے جگہ تو چھوڑ دی ہے لیکن پُرانی رسمیں توڑ کر شہر والوں کی طرح تالاب بنانے اور اس میں نہانے کی اُسے ہمت نہیں ہو رہی۔

حویلی کا پہرہ دیتے ہوتے ہمیں کوئی ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ دونوں سپاہی اور بلال شاہ بیٹھے تاش وغیرہ کھیلتے رہتے۔ کبھی کبھار بلال شاہ نہر سے مچھلیاں پکڑنے چلا جاتا۔ وہ یہاں کے لوگوں سے کافی گھُل مِل گیا تھا اور مَیں اُس کے ذریعے حویلی کے اِردگرد کی صورتحال سے باخبر رہتا تھا۔ ایک جگہ فارغ بیٹھنا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ اگر ایس پی صاحب کا اصرار نہ ہوتا تو مَیں کبھی یہ ڈیوٹی قبول نہ کرتا۔ فراغت کی اِن طویل گھڑیوں میں مَیں اکثر بالائی منزل کی کھڑکیوں میں جمنا کو آتے جاتے دیکھتا تھا۔ وہ ہر وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور کھیل کُود میں مصروف رہتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اپنے اِردگرد کے حالات کی اُسے کوئی پرواہ نہیں۔ ایک دو بار منوج بھی نظر آیا تھا۔ وہ بڑا مغرور قسم کا ہندو نوجوان تھا اُسے دیکھتے ہی جمنا کھِل اُٹھتی تھی اور اُس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک آجاتی تھی۔ مَیں اس چمک کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ یہ تعریفی چمک عورت کی نظروں میں اُس وقت دکھائی دیتی ہے جب کسی ایسے مرد سے اُس کا سامنا ہو جسے وہ چاہتی ہو اور جو اُس کی حفاظت کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ اور یہ حقیقت تھی کہ منوج نہ صرف وجیہہ تھا بلکہ کھُلے ہاتھ پیر کا ایک مضبوط اور تندخو نوجوان تھا۔

مَیں سوچ رہا تھا کہ حویلی کے گیٹ پر بیٹھ کر بوٹا سنگھ کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ میں گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر اُس کی تلاش میں نکل جاؤں۔ بوٹا سنگھ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ ایک بار پہلے بھی میری اس سے مُڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ میں اُسے کوئی بہادر شخص تسلیم نہیں کرتا تھا۔ ہاں ایک بات تھی کہ وہ ہوشیار اور پھُرتیلا ضرور تھا۔ عام سی جسامت کا شخص تھا۔ عُمر کوئی ستائیس اٹھائیس سال کی ہو گی۔ پولیس کی مار نے ایک کان غائب کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے جب اُس کا گروہ اتنا بڑا نہیں ہوا تھا مَیں نے ایک چھاپے میں

اُسے پکڑ لیا تھا لیکن وہ حیرت انگیز چالاکی سے میری آنکھوں میں ریت جھونک کر فرار ہو گیا تھا۔

میں اپنے کمرے سے باہر کرسی پر بیٹھا خیالوں میں غرق تھا کہ ایک آواز سُن کر چونک اُٹھا۔ حویلی کے اندرونی حصّے میں ڈھولک کی تھاپ سُنائی دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لڑکیوں کے گانے کی آواز آئی۔ اس کا مطلب تھا جاگیردار نے جمنا کی شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے آج صبح ہی سے شک ہو رہا تھا۔ کئی عورتیں حویلی کے اندر باہر آ جا رہی تھیں۔ منوج بھی دو تین روز سے نہیں آیا تھا۔ مَیں نے حویلی کے چوکیدار کو آواز دے کر بُلایا۔

"جی صاحب!" اُس نے لاٹھی ہاتھوں میں گھماتے ہوئے کہا۔

"یہ شور کیا ہے؟" مَیں نے پوچھا

"آپ کو نہیں معلوم، بی بی کا بیاہ ہو رہا ہے" بی بی جی سے اُس کی مُراد جمنا تھی۔

"لڑکا کون ہے" مَیں نے اُسے بازو سے پکڑ کر قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی وہی اپنے وجے بابو"۔

"وجے بابو" مَیں سناٹے میں رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا جاگیردار اُس گیارہ سالہ لڑکے سے بیٹی کا بیاہ رچا رہا تھا، ایک لمحے میں جمنا کا بھرپور سراپا میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ اُس کی شوخی اُس کا جوبن، متحرک ہونٹ اور دہکتے ہوئے گال سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے سے گزر گیا۔ یہ ظلم تھا سراسر ظلم۔ چھ سات سال بعد جب خاوند جوانی کی سیڑھی پر قدم رکھے گا بیوی بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑی ہو گی...... راجوں، مہاراجوں اور جاگیرداروں کی ظالمانہ رسموں کے بارے میں مَیں نے بہت کچھ سُنا تھا لیکن ان رسموں کی سفاکی صحیح معنوں میں آج مجھ پر کھلی تھی۔

اتنے میں دُور سے بلال شاہ کی جھلک نظر آئی۔ وہ قریباً بھاگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ وہ اتنی جلدی میں دکھائی دیتا تھا کہ مچھلیاں پکڑنے والی ڈور اس کے پیچھے گھسٹتی چلی آ رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ کوئی اہم خبر لے کر آ رہا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ چوکیدار کی پرواہ کئے بغیر کھٹاک سے وہ خبر میرے سر پر دے مارے گا۔ مَیں خود ہی چوکیدار کے قریب سے اُٹھ کر اُس کی طرف چلا گیا۔

"خان صاحب!" وہ زور سے چیخا۔ مَیں نے اُسے آہستہ بولنے کا اشارہ کیا۔

"خان صاحب" وہ بہت دھیمی آواز میں بولا "بوٹا سنگھ......"

مَیں نے اُسے آرام سے پوری بات بتانے کو کہا۔ بلال شاہ نے بتایا کہ ابھی بوٹا سنگھ اور اُس کے مسلح ساتھی سانڈنیوں پر سوار پُل کی طرف گئے ہیں۔ بلال شاہ کے مطابق اُن کے ارادے خطرناک نظر آتے تھے۔ ایک لمحے میں میرا خیال جمنا کی شادی کی طرف چلا گیا۔ کہیں وہ لوگ...... ہاں یہ ہو سکتا تھا۔ میں نے سپاہیوں کو فوراً گھوڑے تیار کرنے کا حکم دیا۔ اتنے میں جاگیردار بھی حویلی کے اندرونی دروازے سے باہر نکل آیا۔

"کیا بات ہے پتر نواز، کدھر کا ارادہ ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

میں جلدی سے اُسے ایک طرف لے گیا۔ "جاگیردار صاحب، میرے ایک آدمی نے ابھی بوٹا سنگھ کو نہر کے پُل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ آپ کے داماد کو نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آپ کے آدمیوں کا ہمارے ساتھ ہونا ٹھیک نہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ مَیں دوپہر ڈھلنے تک اُس کی مشکیں کس کے آپ کے پاس لے آؤں گا"

جاگیردار کو تسلی دے کر میں اپنے تینوں آدمیوں کے ساتھ بوٹا سنگھ کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ جلد ہی ہمیں کچے راستے پر سانڈنیوں کے پاؤں کے نشانات مل گئے۔ بلال شاہ کے مطابق وہ کوئی چھ آدمی تھے اور تین کے پاس رائفلیں بھی تھیں۔ نہر کے پل پر پہنچ کر ہمیں اندازہ ہوا کہ بوٹا سنگھ کا رُخ جمنا کے سُسرالی گاؤں کی طرف ہی ہے۔ ہماری رفتار میں مزید تیزی آ گئی، کوئی دو کوس گھوڑے دوڑانے کے بعد ہمیں اپنے سامنے سانڈنی سواروں کی اڑائی ہوئی دُھول نظر آنے لگی۔ شدید گرمی اور تپتی ہوئی دوپہر میں یہ دُھول کسی صحرائی بگولے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جونہی ہم ایک ویران رہٹ کے قریب سے گزرے چھ سات نقاب پوش پاس کی جھاڑیوں سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے برآمد ہوئے اور ہم پر حملہ آور ہو گئے۔ اُن کا اندازہ تو ایسا ہی تھا کہ جیسے ہمیں روندتے ہوئے گزر جائینگے اور وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ بلال شاہ سمیت دونوں سپاہی لاٹھیوں کی ضربیں کھا کر گھوڑوں سے نیچے گر گئے تھے۔ لیکن میں چونکہ ذرا آگے تھا اس لئے ان کی زد سے محفوظ رہا۔ یہ کچھ سوچنے کا نہیں کرنے کا وقت تھا۔ میں نے گھوڑے کو تیزی سے واپس موڑا۔ ریوالور میں اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ میں نے مڑتے ساتھ ہی دیکھ لیا کہ صرف دو آدمیوں کے پاس رائفلیں ہیں۔ میں نے قریب والے شخص پر دو فائر کئے۔ ریوالور کی سُبک رفتار گولیاں دھماکوں سے اُس کے بازو اور چھاتی میں گھس گئیں۔ دوسرے شخص نے رائفل سیدھی کی ہی تھی کہ نیچے گرے ہوتے بلال شاہ نے اُچھل کر رائفل تھام لی پھر ایک زوردار جھٹکے سے اُس نے رائفل چھین لی۔ رائفل ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سارے گھڑسوار بلال شاہ کی طرف لپکے۔ اس سے پہلے کہ وہ برچھیاں استعمال کرتے، میں ہوائی فائر کرتے ہوتے گرجا "خبردار جان سے مار دوں گا۔"

حملہ آور ٹھٹھکے اتنے میں بلال شاہ بندوق سنبھال چکا تھا۔ اب ایک طرف سے وہ بندوق اور دوسری طرف سے ریوالور کی زد میں تھے۔ زخمی شخص گھوڑے پر اوندھا پڑا تھا اور اُس کا گھوڑا بھگٹٹ بھاگا جا رہا تھا۔ باقی چھ آدمی ہراساں نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک ڈیل ڈول سے سرغنہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ریوالور کا رُخ اس کی پیشانی کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"پگڑی ہٹاؤ چہرے کے اُوپر سے۔"

وہ گم سُم کھڑا رہا۔ میں نے پھر تحکمانہ لہجے میں اپنا فقرہ دُہرایا۔ اُس کا ہاتھ پھر بھی پگڑی کی طرف نہیں گیا۔ ایک ساعت کے لئے میری نظر دوسرے افراد کی طرف اُٹھی تھی کہ آنکھوں میں چمک سی لہرا گئی۔ غیر ارادی طور پر میں نے اپنا سر ایک جانب جھکایا اور کوئی چیز سنسناتی ہوئی میرے کان کے نزدیک سے گزر گئی۔ حملہ آوروں کے سرغنہ نے تاک میرے اُوپر برچھی پھینکی تھی۔ جب میں نے اُس کی طرف دیکھا اُس کا گھوڑا برق رفتاری سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ نقاب پوش کا یہ وار اپنی مثال آپ تھا۔ ایک لمحے میں نہ صرف اُس نے مجھ پر برچھی پھینک دی تھی بلکہ اتنی تیزی سے گھوڑے کو ایڑ لگائی تھی۔ اور گھوڑے نے بھی اتنی تیزی سے اپنے سوار کا ساتھ دیا تھا کہ مجھے ریوالور استعمال کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ میں جب خود کو گھوڑے کی زد سے بچا کر سنبھلا گھوڑا بیس پچیس گز آگے نکل چکا تھا۔ میں نے دو گولیاں چلائیں۔ ایک گولی گھوڑے کی پشت پر لگی لیکن سوار محفوظ رہا۔ بلال شاہ بندوق ہاتھوں میں تھامے تذبذب کے عالم میں کھڑا تھا۔ میں نے اُس سے بندوق لے کر دو گولیاں اور چلائیں لیکن حملہ آور دُور نکل چکے تھے۔ ایک لمحے کے لئے میں نے اُن کے تعاقب کا سوچا لیکن پھر میرا دھیان بوٹا سنگھ کی طرف چلا گیا۔ سانڈنی سواروں

کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ اگر ہم گھڑ سواروں کے تعاقب میں نکل جاتے تو بوٹا سنگھ کا وار چلنا یقینی تھا۔ سپاہی محمد حسین کا بازو اتر گیا تھا، بلال شاہ کا سَر بھی پھٹ گیا تھا لیکن میں نے بغیر مرہم پٹی کے انہیں سانڈنی سواروں کے پیچھے چلنے کا حکم دیا۔

پوری رفتار سے گھوڑے بھگاتے ہوئے جب ہم کوئی آدھ گھنٹے بعد مادھو پور میں داخل ہوئے، بوٹا سنگھ اپنا کام کر چکا تھا۔ جاگیردار کے داماد یعنی نوعمر وجے کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ وجے کے باپ نے ہمیں روتے ہوئے جو تفصیلات بتائیں اُن سے معلوم ہوا کہ بوٹا سنگھ نے یہ کام بڑی صفائی سے بغیر خون خرابے کے کیا تھا۔ اُس کے ساتھی گاؤں سے باہر موجود رہے تھے۔ وجے گلی میں کھیل رہا تھا۔ بوٹا سنگھ اُسے ورغلا کر گاؤں سے باہر لے آیا تھا۔ یہاں سے وہ لوگ اُسے آگے لے گئے تھے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے وجے کے گھر والوں کو اس کی اطلاع دی تھی۔ مَیں نے گاؤں سے چند آدمیوں کو ساتھ لیا اور فوراً بوٹے کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ شام تک ہم نے کئی جگہ چھاپے مارے لیکن مجرموں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

میں جاگیردار کے کمرے میں داخل ہوا تو منوج وہاں موجود تھا۔ دو تین اور آدمی بھی سَر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ وجے کے اغوا کی خبر انہیں مل چکی تھی۔ جاگیردار نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مَیں نے انہیں مختصر لفظوں میں بتایا کہ کس طرح راستے میں کچھ آدمیوں نے ہم پر ہلّہ بول دیا اور ہم مجرموں کا تعاقب جاری نہ رکھ سکے۔ منوج خاموشی سے میری باتیں سُن رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا اُس کے اندر لاوا پک رہا ہے۔ میرے خاموش ہوتے ہی بولا۔

"تھانیدار جی! آپ زندگی میں کسی جگہ وقت پر بھی پہنچے ہیں یا نہیں؟"

جاگیردار نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "بھئی وہ بتا تو رہا ہے کہ کچھ لوگوں نے پولیس پارٹی کو راستے میں روک لیا تھا۔"

"یہ سب باتیں ہیں" منوج آگ بگولا ہو کر بولا "اِن کو کس حکیم نے کہا تھا کہ بغیر کسی کو بتائے اکیلے ہی بوٹا سنگھ سے نپٹنے چلے جائیں۔ ہماری رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی ہے اِن لوگوں نے۔"

مَیں نے مجرموں سے چھینی ہوئی بندوق اُس کے سامنے کرتے ہوئے کہا "یہ بندوق اور میرے آدمیوں کے پھٹے ہوئے سَر کیا یہ بتانے کے لئے کافی نہیں کہ مَیں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"یہ سب چالبازیاں ہوتی ہیں پولیس والوں کی"۔ منوج نے پھنکار کر کہا اور پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ مَیں نے بھی کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھا اور اُٹھ کر باہر آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ ایس پی صاحب سے رابطہ قائم کروں اور اُن سے کہوں کہ مجھے "چوکیداری" کے اس فرض سے سبکدوش کر دیں۔ میں ایک عملی آدمی تھا۔ فراغت مجھے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ دوسری طرف میں دیکھ رہا تھا کہ منوج کا اس حویلی میں کافی اثر و رسوخ ہے اور وہ مجھے پسند نہیں کرتا۔ بہتر یہی تھا کہ مَیں واپس چلا جاؤں لیکن ایک چیز ایسی تھی جو مجھے بار بار اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میرا یہ شک روز بروز پختہ ہو رہا تھا کہ بوٹا سنگھ لڑکی کو اغوا کرنا نہیں چاہتا۔ مَیں نے اب تک کے تمام واقعات کا بغور جائزہ لیا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ اگر بوٹا سنگھ لڑکی کو اغوا کرنا چاہتا یا اُسے نقصان پہنچانا چاہتا تو کامیاب ہو سکتا تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہ صرف اِن لوگوں کو خوفزدہ کرنا چاہتا ہے۔ جب اُس نے پہلی دفعہ حویلی پر ہلّہ بولا تھا تو یہاں

کے حفاظتی انتظامات نہ ہونے کے برابر تھے۔ بوٹا سنگھ چوری چھپے یا علی الاعلان حویلی میں داخل ہو سکتا تھا لیکن پہریداروں کی معمولی مزاحمت پر وہ بھاگ گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اُس کا منشا لڑکی کو اغواء کرنا نہیں تھا پھر اُس کا منشا کیا تھا؟ وہ جاگیردار کو خوفزدہ کر کے کیا حاصل کرنا چاہتا تھا؟ یہی پہلو میرے لئے پُراسرار تھا۔ میں کتنی ہی دیر اس پہلو پر غور کرتا رہا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے سوچ بچار صبح پر ملتوی کی اور سو گیا۔

صبح ایک غیر مانوس شور سُن کر میری آنکھ کھُل گئی۔ میں کافی دیر تک سوتا رہا تھا۔ دھوپ کافی چڑھ آئی تھی۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ حویلی کے وسیع و عریض صحن میں باغ کی جانب مجمع لگا ہوا تھا۔ تین آدمی دو عورتوں کو ہنٹروں سے پیٹ رہے تھے۔ ایک عورت ادھیڑ عمر اور دوسری نوجوان تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان عورت کی گود سے شیر خوار بچہ زمین پر گر پڑا لیکن مارنے والوں نے اُسے بچہ اٹھانے کی مہلت بھی نہیں دی۔ قریب ہی تین آدمی نیم بے ہوشی کے عالم میں سسک رہے تھے۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر منوج دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا تھا۔ جاگیردار بھی پاس ہی موجود تھا۔ پھر جاگیردار نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ہنٹر برسانے والے رُک گئے۔ جاگیردار، منوج سے باتیں کرتا ہوا حویلی کے اندر چلا گیا۔ میں جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے باہر آیا۔ گاؤں والے زخمی عورتوں اور مردوں کو سہارا دیتے خاموشی سے باہر لے جا رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر بلال شاہ نے بتایا کہ جاگیردار کے اصطبل میں سے ایک قیمتی گھوڑی چوری ہو گئی ہے۔ ان لوگوں کو رسہ گیری کے شبے میں پیٹا جا رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ ان لوگوں سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔

تھوڑی دیر بعد جاگیردار کی طرف سے بُلاوا آ گیا۔ میں اس وقت ناشتہ کر رہا تھا۔

ناشتہ کر کے میں اندر پہنچا تو جاگیردار سخت غصے میں نظر آ رہا تھا۔ منوج بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اصطبل کا نگران ہاتھ باندھے اُن کے پیچھے کھڑا تھا۔ جمنا بھی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا تھوڑی دیر پہلے تک روتی رہی ہے۔ سیاہ دوپٹے میں اُس کا چہرہ کچھ زیادہ ہی نکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کافی خوبصورت ہے۔ جاگیردار نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے ایک گھوڑی چوری ہو گئی ہے۔ یہ ہماری بیٹی کی لاڈلی گھوڑی تھی۔ ہم ہر قیمت پر وہ گھوڑی اصطبل میں واپس دیکھنا چاہتے ہیں۔"

اتنے میں منوج بولا "دیکھو تھانیدار جی! میں بات کرتا ہوں صاف اور سیدھی۔ ہمیں، آپ کے ایک آدمی پر شبہ ہے۔ وہ موٹا سا لمبا سا کیا نام ہے اُس کا بلال۔ وہ ہر وقت اصطبل کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ اصطبل کا چوکیدار گواہ ہے اس کی حرکتوں کا۔ کچھ بھی ہو ہمیں شام تک گھوڑی واپس ملنی چاہیئے ورنہ ......"

"بس منوج صاحب" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے چپ رہنے کو کہا۔ "اب کوئی لفظ زبان سے نہ نکالنا۔ تم نے میرے آدمی پر نہیں مجھ پر شک کیا ہے۔ چور کوئی بھی ہو شام سے پہلے گھوڑی اصطبل میں پہنچ جائے گی۔"

میں اُٹھا اور تیزی سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ خون کی گردش سے میری کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ ان لوگوں نے ایک طرح مجھ پر چوری کا شبہ کیا تھا۔ میں جو اب تک چوروں، ڈاکوؤں کے لئے دہشت کا نشان تھا اِس جاگیر میں آ کر خود چور ٹھہرایا جا رہا تھا۔ اور یہ سب منوج کا کیا دھرا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا "بنیئے کے بیٹے! تم نے نواز خان سے ٹکر لی ہے اب بھگتنے کے لئے تیار ہو جاؤ" میں نے دل میں سوچا۔

منوج کا اُدھار چکانے سے پہلے مجھے جمنا کی گھوڑی برآمد کرنا تھی۔ میں جب کمرے سے باہر نکل رہا تھا، جمنا کی آواز سنائی دی تھی وہ جاگیردار سے کہہ رہی تھی "پتا جی! آپ پھر اس تھانیدار کی بات پر بھروسہ کر رہے ہیں۔ آپ اپنے آدمیوں سے گھوڑی تلاش کیوں نہیں کرواتے۔" اس کی یہ آواز میرے کانوں میں سیسہ پگھلا رہی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا تھا کہ ان لوگوں کے ذہن میں اب تک میرا کوئی اچھا تاثر قائم نہیں ہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آج شام تک گھوڑی کو زندہ یا مُردہ برآمد کر کے رہوں گا۔"

میں جب باہر آیا بلال شاہ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چونک گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں غصے میں ہوں اور اب کچھ ہونے والا ہے۔ میں نے اُسے ساتھ لیا اور سیدھا اصطبل کی طرف چل دیا۔ اصطبل حویلی کے بالکل ساتھ ہی واقع تھا۔ اُس وقت وہاں کوئی تیس گھوڑیاں گھوڑے موجود تھے۔ دو ملازم اُن کے آگے چارہ وغیرہ ڈال رہے تھے۔ میں نے گہری نظروں سے اصطبل کا معائنہ کیا۔ چور موقعہ واردات پر کوئی نہ کوئی نشان ضرور چھوڑتا ہے۔ ایک جگہ مجھے سیاہی مائل چپ چپی سی شے فرش پر گری ہوئی نظر آئی۔ میں نے انگلی لگا کر سُونگھا اس میں سے ناگوار بُو اُٹھ رہی تھی۔ بلال شاہ گھوڑوں اور اُن کی خوراک وغیرہ کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔ میں نے مائع اُس کے نتھنوں سے لگاتے ہوئے پوچھا "کیا ہے؟" اُس نے زور سے سانس اندر کی طرف کھینچا اور بولا۔

"یہ دوائی ہے جی۔ مویشیوں کے زخموں پر لگاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جلدی سے کہا "ان تمام جانوروں کو دیکھو کسی کو زخم تو نہیں۔"

بلال شاہ جلدی جلدی اصطبل میں گھوم گیا "نہیں خاں صاحب" اُس نے آکر بتایا۔ میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا گھوڑی چرائی نہیں گئی تھی

زخمی ہوئی تھی۔ اُس کی مرہم پٹی کے لئے دوائی اصطبل سے باہر لے جائی گئی تھی۔ اس بات کو جاگیردار سے چھپایا گیا تھا۔ کہیں یہ منوج کا کام تو نہیں۔ وہ اکثر اصطبل سے گھوڑے لے کر جاتا رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ گھوڑی لے کر گیا ہو۔ وہ زخمی ہو گئی ہو اور اُس نے جاگیردار یا جمنا کے خوف سے اِسے کہیں چھُپا دیا ہو۔ یہ بہت ممکن تھا ..... ایک دم ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کل دوپہر کا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ جب نقاب پوش نے مجھ پر گھوڑا چڑھایا تھا اور میں نے پہلو بچا کر اس پر گولی چلائی تھی۔ ایک گولی گھوڑے کو لگی تھی..... یقیناً یہ وہی گھوڑی تھی..... اوہ میرے خدا اس کا مطلب تھا منوج اور بوٹا سنگھ ساتھی تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ذہن ایک لمحے میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ بلال شاہ منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"بلال" میں نے کھوتے ہوتے لہجے میں کہا "کل جو گھوڑی زخمی ہوئی تھی تمہیں یاد ہے؟"

"ہاں سفید گھوڑی تھی" بلال شاہ نے کہا اور پھر اس کی آنکھوں میں ایک دم حیرت نظر آنے لگی۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں بلال شاہ! وہ گھوڑی اسی اصطبل سے گئی تھی۔"

پھر میں نے بلال شاہ کو کہا کہ اصطبل کے نگران کو بُلا لاتے۔ تھوڑی دیر بعد نگران آ گیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک جہاندیدہ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا اضطراب یا خوف نہیں تھا۔ میں نے دونوں ملازموں کو باہر نکال کر اصطبل کا دروازہ بند کر دیا۔

"دیکھو۔ جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں معلوم ہے تم نے زخمی گھوڑی کہاں چھُپا رکھی ہے۔ جب تم اصطبل سے دوائی لے کر گئے تھے میرا آدمی تمہارے پیچھے تھا۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب کچھ تم سے کس نے کروایا ہے لیکن میں تمہاری زبان سے سُننا چاہتا ہوں۔" نگران کی آنکھوں میں ہلکا ہلکا خوف نظر آ رہا تھا لیکن بظاہر وہ پُرسکون تھا۔ اُس نے تمام واقعے سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔

مَیں نے پھر کہا "دیکھو میاں! اگر تمہیں کسی کا خوف ہے تو دِل سے نکال دو۔ اس حویلی میں "انقلاب" آنے والا ہے جو نام تمہاری زبان پہ ہے مَیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اب بے خطر ہو کر وہ نام بول دو۔"

نگران پھر بھی خاموش رہا۔ میرا پارہ ایک دم نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لئے۔ پھر ایک جھٹکے سے اُسے اوندھے منہ زمین پر گرا دیا۔ اُس کی گردن قابو میں کر کے میں نے دونوں بازو پُشت کی طرف موڑ دیئے۔ "چاقو نکالو بلال شاہ" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ بلال شاہ نے شلوار کے نیفے سے گراری والا چاقو نکال لیا۔ میں نے اُسے آنکھوں سے اشارہ کیا اس نے "کرر" کی خوفناک آواز سے چاقو کھولا اور نگران کے مُڑے ہوئے ہاتھ کی انگلی ہاتھوں میں تھام لی۔

"کس کے کہنے پر تم یہ سب کچھ کر رہے ہو؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں، مجھے کچھ معلوم نہیں" وہ حلق کی پوری قوت سے چیخا۔

"کاٹ ڈالو انگلی" مَیں نے سرد لہجے میں کہا۔

بلال شاہ کا چاقو حرکت میں آیا اور نگران کی دلدوز چیخ سن کر گھوڑے اچھل کود کرنے لگے۔

"کس کے کہنے پر تم یہ سب کچھ کر رہے ہو؟" مَیں نے پھر اپنے الفاظ دہراتے۔

وہ ذبح ہوتے ہوتے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا۔ مَیں نے بلال شاہ سے کہا دوسری اُنگلی بھی کاٹ ڈالو۔ بلال شاہ نے اِس کی دُوسری اُنگلی پکڑی ہی تھی کہ وہ چلّانے لگا "بتاتا ہوں سب کچھ بتاتا ہوں" اس کے بعد وہ فرفر بولنے لگا۔ اُس نے بتایا کہ منوج بابو نے حکم دیا تھا کہ گھوڑی کے زخمی ہونے کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ وہی کل دوپہر گھوڑی اصطبل سے لے کر گئے تھے۔ جب وہ اپنا بیان مکمل کر چکا میں نے اُسے سیدھا کر کے زمین سے اُٹھایا۔ اُس نے جلدی سے اپنے خون آلود ہاتھ کی طرف دیکھا لیکن انگلی ہاتھ پر ہی موجود تھی۔ بلال شاہ کا لگایا ہوا زخم چوتھائی انچ سے گہرا نہیں تھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد مَیں زخمی گھوڑی لئے ہوئے حویلی میں داخل ہو رہا تھا۔ منوج نے اُسے گاؤں سے باہر اپنے ایک دوست کے ڈیرے پر باندھ رکھا تھا۔ مَیں نے گھوڑی اصطبل میں پہنچائی اور جاگیردار کے کمرے میں جا کر اُسے برآمدگی کی خبر سنائی۔ پھر مَیں نے اُس سے اجازت طلب کی۔ جاگیردار نے جانے کا سبب پُوچھا تو میں نے بتایا کہ میں ایک مجرم کے خلاف کارروائی کرنا چاہتا ہوں اور اُس کے گھر میں رہ کر میں اُس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ جاگیردار حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہاں جاگیردار صاحب" مَیں نے ٹھوس لہجے میں کہا "منوج آپ کا بھتیجا ہے اور آپ اسے بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں۔ لیکن وہ مجرم ہے۔ یہ وہی گھوڑی ہے جو کل میری گولی سے زخمی ہوئی تھی اور کل یہ گھوڑی منوج کے نیچے تھی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" جاگیردار نے چونک کر کہا۔

"منوج، بُوٹا سنگھ کا ساتھی ہے۔" مَیں نے اطمینان سے کہا "وہ بوٹا سنگھ کے ذریعے آپ کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"کیوں اُس کا کیا فائدہ ہے اس میں؟" جاگیردار کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سننا چاہتے ہیں تو سُنیئے۔ وہ آپ کی بے شمار دولت کے لالچ میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ آپ بوٹا سنگھ کی کارروائیوں سے پریشان ہو کر جمنا کی فوری شادی کا فیصلہ کریں۔ اِس صورت میں قرعہ یقیناً اُس کے نام نکلتا لیکن آپ نے شادی کا فیصلہ تو کر لیا مگر داماد منوج کی بجائے وجے ہی رہا۔ اپنی جیت کو ہار میں بدلتے دیکھ کر اُس نے بوٹا سنگھ کے ہاتھوں وجے کو اٹھوانے کا پروگرام بنایا۔ جب میں بوٹا سنگھ کے تعاقب میں روانہ ہوا تو منوج خبردار ہو گیا۔ وہ اُس وقت یہیں موجود تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پولیس پارٹی کا تعاقب کیا اور راستے میں روک لیا۔ بعد کے واقعات آپ جانتے ہی ہیں۔"

جاگیردار کے چہرے پر زلزلے کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس کے کسی اندرونی خدشے کی تصدیق ہو گئی ہے۔

اُس شام حویلی میں زبردست طوفان آیا۔ جاگیردار نے مجھے منوج کو گرفتار کرنے کی اجازت تو نہیں دی لیکن جب وہ حویلی میں آیا تو اُسے دھکے دے کر باہر نکلوا دیا۔ منوج نے حویلی کے دروازے پر کھڑے ہو کر بھگوان کی قسم کھائی کہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اُس کا خیال تھا اُس کی بے عزّتی کا ذمّہ دار صرف میں ہوں۔ جاگیردار کو دل کا دورہ پڑا۔ جمنا نے مجھ سے بدکلامی کی۔ میں نے حویلی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا لیکن جاگیردار منتوں واسطوں پر اُتر آیا۔ اُس نے مجھے جانے سے روک لیا۔ حویلی میں موجود منوج کے ساتھ ملے ہوئے تمام مُلازمین کو چھٹی دے دی گئی۔ جاگیردار کافی بیمار ہو گیا تھا۔ میں نے امرتسر سے اپنے ایک واقف کار ڈاکٹر کو بُلوایا۔ اُس نے بڑی توجہ سے جاگیردار کا علاج کیا۔ کوئی ایک

ہفتے بعد جاگیردار کی حالت کچھ سنبھلی۔ اُس نے مجھے اپنے پاس بُلا کر کہا۔

"نواز! تم ایک سرکاری مُلازم ہو لیکن جس طرح تم نے اِس حویلی کی حفاظت کی ہے۔ میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں چُکا سکتا۔ ان چند دنوں میں تم مجھے گھر کے ایک فرد کی طرح لگنے لگے ہو۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ مجھے کچھ روز کے لئے لاہور جانا پڑے گا۔ میں یہاں کا انتظام بڑے منشی صاحب کو سونپ کر جا رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے وہ بڑے نیک طبیعت اور صلح جُو آدمی ہیں۔ تمہیں اُن سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم حویلی کی پُوری طرح دیکھ بھال کرو۔ جمنا کو میں نے سمجھا دیا ہے۔ وہ بچّی ہے اگر کوئی بات کہہ دے تو بُرا نہ ماننا۔"

میں جاگیردار کی بات سمجھ رہا تھا۔ میں نے انہیں پُوری تسلی دی۔ اگلے روز وہ لاہور روانہ ہو گئے۔

بڑے منشی عطا صاحب بڑے نیک اور مخلص آدمی تھے۔ ان چند ہفتوں میں میں انہیں اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ جاگیردار کو ان پر اندھا اعتماد تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ جمنا کا رویّہ اُن سے ٹھیک نہیں۔ جاگیردار کے جانے کے بعد میں نے ایک دو بار جمنا کو بڑے سخت لہجے میں منشی صاحب سے باتیں کرتے ہوئے سُنا۔ ایک روز تو حد ہو گئی۔ میں اپنے کمرے کے سامنے کُرسی بچھائے بیٹھا تھا۔ میرے سامنے منوج کا وہ دوست تھا جس کے ڈیرے سے مسروقہ گھوڑی برآمد ہوئی تھی۔ پچھلے تین روز سے میں اُس سے پُوچھ گچھ کر رہا تھا۔ لیکن اُس نے منوج یا بوٹا سنگھ کے بارے میں کوئی کارآمد بات نہیں بتائی تھی۔ حویلی سے جانے کے بعد منوج غائب ہو گیا تھا اور کئی روز گزرنے کے باوجود اُس کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا۔ ابھی میں باتوں میں مصروف تھا کہ اوپر بالکونی سے

شور کی آواز سنائی دی۔ میں بھاگتا ہوا اُوپر پہنچا۔ ایک انتہائی تکلیف دہ منظر میرے سامنے تھا۔ جمنا اور اس کی سہیلیاں عطا صاحب کو جوتیوں سے پیٹ رہی تھیں۔ عطا صاحب کے ہاتھ میں شائد کچھ رجسٹر تھے، کچھ رجسٹر زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے بمشکل انہیں لڑکیوں سے نجات دلائی۔ ان کی عینک ٹوٹ چکی تھی وہ بازوؤں میں منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگے۔ جمنا بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ان پر جھپٹ رہی تھی۔ وہ اس وقت اُدھورے اور نامکمل لباس میں تھی۔

"یہ بُری نیت سے میرے کمرے میں آیا تھا۔ میں اِسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

وہ عراقی عطا صاحب ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے "خدا کی قسم میں ساتھ والے کمرے میں رجسٹر رکھنے گیا تھا۔ غلطی سے اس کمرے میں داخل ہو گیا۔"

"داڑھی والے شیطان میں تیری کھال اُدھیڑ دوں گی۔" وہ چیخی۔ میرا دماغ سنسنا اُٹھا۔ پھر میرا ہاتھ اُٹھا اور ایک زوردار تھپڑ جمنا کے گال پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرائی۔ تمام لڑکیاں چیختی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں۔ وہ پھٹی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے عطا صاحب کو سہارا دیا اور نیچے لے آیا۔ کافی دیر میں اُن کی دلجوئی کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ برابر روتے جا رہے تھے "خدا کی قسم میں نے اُسے گود میں کھلایا ہے۔" وہ بار بار یہ الفاظ دُہرا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر چلے گئے۔ کوئی دو گھنٹے بعد ایک مُلازم نے مجھے ایک خط لا کر دیا۔ یہ عطا صاحب کی طرف سے تھا۔ اِس میں اب تک کے حساب کتاب کی مکمل تفصیل درج تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے تھے۔ آخر میں انہوں نے ایک فقرہ لکھا تھا "اگر مجھے حرام موت کا خوف نہ ہوتا تو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر موت کو گلے لگا لیتا۔ نواز صاحب! میرے بیوی بچّوں کو کہہ دینا

کہ مَیں مر چکا ہوں۔ خدا حافظ۔"

میرا دِل چاہ رہا تھا اِس بدذات لڑکی کے ٹکڑے کر دوں۔ اُسے منشی جی کے جانے کی "خوشخبری" سنانے کے لئے جب میں حویلی کے اندر گیا تو وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ اُس کا کمرہ خالی تھا۔ سہیلیاں بھی موجود نہیں تھیں۔ حویلی کی بوڑھی خادمہ نے بتایا کہ وہ ابھی کالُو کے ساتھ سیڑھیاں اُتر کر نیچے گئی ہے۔ کالُو وہی پہلوان نما شخص تھا جو برچھی تھامے ہر وقت جاگیردار کے ساتھ رہتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا وہ اُس کے ساتھ کہاں گئی ہے۔ پچھلے پہر تک جب لڑکی کی اطلاع نہیں ملی تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس وقت مادھو پُور تھانے کا انسپکٹر قربان علی بھی مجھ سے ملنے آ گیا۔ وہ "دیجے" کے اغوا کی تفتیش میں مصروف تھا۔ اُس نے کہا کہ ابھی تک لڑکے کا کوئی سراغ ہاتھ نہیں آیا۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ حویلی کا ایک تانگہ اسٹیشن جانے والے راستے پر جا رہا تھا۔ اُس میں ایک لڑکی اور موٹا سا ایک شخص سوار تھے۔ اُس نے موٹے شخص کا حلیہ بیان کیا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ جمنا اور کالُو کا ذکر کر رہا ہے۔ میرے لئے یہ اچھا موقع تھا۔ قربان علی کو حویلی میں چھوڑ کر میں جمنا کی تلاش میں جا سکتا تھا۔ میں نے اُسے پوری بات سمجھائی۔ وہ بیچارا آج رات اپنے گھر جا رہا تھا۔ دو تین روز میں اس کی شادی ہونے والی تھی۔ بہرحال میرے اصرار پر اُس نے رُکنے کی حامی بھر لی۔ اسے ہدایات دے کر میں بلال شاہ کے ساتھ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسٹیشن وہاں سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ راستہ کچّا اور دشوار گزار تھا۔ ہم گھوڑوں پر سوار تھے جس رفتار سے ہم جا رہے تھے، تانگے کے لئے اس سے آدھی رفتار بھی برقرار رکھنا مشکل تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ ہم راستے ہی میں تانگے کو جا لیں گے۔ نصف راستے میں اندھیرا پڑ گیا۔ رات تاریک تھی اور دُور دُور تک

کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ راستہ غیر آباد زمینوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ گندم کے ادھ پکے کھیت بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اچانک ایک آواز سن کر میں چونک گیا۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی گھٹی ہوئی آواز میں چیخا ہو۔ چیخ کسی عورت کی لگتی تھی۔ چند لمحے بعد ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی ایک اور چیخ سنائی دی۔ اس بار آواز بالکل صاف تھی کوئی عورت مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ میں نے گھوڑا روکا۔ بلال شاہ بھی رُک گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور گھوڑے ایک درخت سے باندھ کر گھنی جھاڑیوں کی طرف چل دیئے۔ تھوڑی ہی دور مجھے اندھیرے میں کوئی چیز نظر آئی۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو یہ حویلی کا تانگہ تھا۔ تانگہ خالی تھا اور گھوڑا گھاس پر منہ مار رہا تھا۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ بلال شاہ کو تانگے کے قریب رُکنے کا کہہ کر میں نے پستول نکالا اور جھاڑیوں میں گھس گیا۔ جب دوسری بار چیخ کی آواز سنائی دی تھی میں نے سمت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ بڑی احتیاط سے چلتا ہوا میں آگے بڑھ رہا تھا۔ دوسری چیخ کے بعد کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ قریباً پانچ منٹ چلنے کے بعد مجھے ایک جگہ سفید دھبہ سا نظر آیا۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو یہ جھاڑی میں اٹکی ہوئی ریشمی کپڑے کی ایک دھجی تھی۔ میں نے آنکھوں کے قریب لاکر غور سے جائزہ لیا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ جمنا مصیبت میں تھی۔ یہ اُس کی قمیص کا ایک ٹکڑا تھا۔ میں چند قدم اور آگے بڑھا تو ایک جانب سے کھسر پھسر کی آواز سنائی دی۔ تب ایک مرد کا قہقہہ سنائی دیا۔ میں نے پستول چیک کیا اور دبے قدموں چلتا ہوا آواز کی سمت بڑھنے لگا۔ کوئی تیس گز آگے جھاڑیوں کے درمیان تھوڑی سی کھلی جگہ پر کسی شخص کا ہیولا نظر آرہا تھا۔ میں پہچان گیا۔ یہ "کالُو" تھا۔ جمنا زمین پر گری ہوئی تھی۔ کالُو کہہ رہا تھا۔

"بھاگ لو دیوی۔ جتنا بھاگ سکتی ہو بھاگ لو۔ دس دس کوس چاروں طرف میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ تمہارے پتا کا نمک خوار ہوں۔ بھگوان کی سوگند جب تک بھاگتی رہو گی تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

جمنا کے ہانپنے کی آواز میں اتنی دُور سے سن رہا تھا۔ جسے وہ محافظ سمجھ کر لائی تھی وہ لٹیرا بن گیا تھا۔

"کالُو بھگوان سے ڈرو۔ میں کہتی ہوں بھگوان سے ڈرو" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولی۔

جواب میں کالُو کا بلند قہقہہ سنائی دیا "میں تمہارے بھاگنے کا انتظار کر رہا ہوں دیوی۔"

میں نے دیکھا جمنا کے ہیولے میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ کالُو تھوڑی دیر اُس کی طرف دیکھتا رہا پھر جھومتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ جمنا کی گھٹی ہوئی چیخ بلند ہوئی۔ اس سے پہلے کہ کالُو اُس کے جسم سے کپڑے کی دھجیاں نوچ ڈالتا میں نے جھاڑیوں سے نکل کر اُسے للکارا۔ وہ تیزی سے گھوما اور یوں میری طرف دیکھنے لگا جیسے مجھے بھوت سمجھ رہا ہو۔ اس کے ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی میں تیزی سے آگے بڑھا اور میری زوردار ٹانگ اُس کے منہ پر پڑی وہ اُلٹ کر جھاڑیوں کے قریب جا گرا۔ گرتے وقت اس کی بوتل کسی پتھر سے ٹکرائی اور ٹوٹ گئی۔ سر جھٹک کر وہ تیزی سے اُٹھا اور خوفناک انداز سے میری طرف بڑھنے لگا۔ ٹوٹی ہوئی بوتل وہ چاقو کے انداز میں لہرا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول شاید اُسے نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے اُسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا "خبردار میرے ہاتھ میں پستول ہے۔" لیکن میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ اُچھلا

اور مجھے ساتھ لیا ہوا زمین پر گر گیا۔ بائیں بازو میں شدید ٹیس محسوس ہوئی۔ ٹوٹا ہوا شیشہ ہڈی تک گوشت میں گھس گیا تھا۔ غصے سے بے قابو ہو کر میں نے سَر کی زوردار ٹکر اُس کے منہ پر ماری۔ اُس کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور میں نے اُسے اُٹھا کر نیچے کر لیا۔ تب احساس ہوا کہ میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں پستول کہیں گر چکا تھا۔ اُس وقت کالو نے دونوں ٹانگیں میرے پیٹ پر جمائیں اور مجھے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ میں جمنا کے قریب جا کر گرا۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور سہمی ہوئی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ میرے کھڑے ہوتے ہی کالو پہلوانوں کے انداز میں اُچھلا اور اس کی دونوں ٹانگیں بھرپور قوت سے میرے سینے پر پڑیں۔ میں جیسے اڑتا ہوا جھاڑیوں میں جا گرا۔ حریف توقع سے زیادہ طاقتور اور پُھرتیلا تھا۔ میں سوچ رہا تھا مجھے فوراً اپنا پستول استعمال کرنا چاہیئے تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے حواس بجا کئے اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کالو جھاڑیاں ہٹاتا ہوا میرے قریب پہنچا۔ وہ نہایت غلیظ گالیاں بک رہا تھا اور جمنا نے اُونچی آواز میں رونا شروع کر دیا تھا۔ جھاڑیوں میں گھسنا کالو کے لئے قیامت بن گیا۔ میں نے ایک جھاڑی کی شاخ سے لٹک کر دونوں بُوٹ پُوری قوت سے اُس کے منہ پر جمائے وہ ڈکراتا ہوا خالی جگہ پر جا گرا۔ میرے وزن سے جھاڑی کی شاخ تڑخ گئی تھی۔ میں نے زور لگا کر شاخ توڑی اس سے پہلے کہ کالو اُٹھتا میں اُس کے سَر پر پہنچ چکا تھا۔ سَر پر لگنے والی دو بھرپور ضربوں نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا..... اور تب مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے۔ بازو کا زخم میری توقع سے کہیں بڑھ کر تھا۔ آستین بُری طرح خون میں لتھڑ چکی تھی۔ بہر حال میں ایک لڑکی کے سامنے کسی قسم کی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس کا بازو پکڑا اور جھاڑیوں میں سے راستہ بناتا ہوا تانگے

کی طرف چل دیا۔

میں نے دونوں گھوڑے بلال شاہ کے سپرد کئے اور خود جمنا کو لے کر تانگے پر بیٹھ گیا۔ کالو کا بے ہوش جسم بمشکل سیٹوں کے نیچے گھسیڑا گیا۔ راستے بھر جمنا دوسری طرف منہ پھیرے بیٹھی رہی۔ اُس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ حویلی پہنچے تو ایک اور وحشتناک خبر میری منتظر تھی۔ نامعلوم افراد حویلی میں داخل ہو کر انسپکٹر قربان علی کو قتل کر گئے تھے۔ میں حویلی پہنچا تو انسپکٹر کی لاش میرے کمرے میں میرے ہی بستر پر پڑی تھی۔ اُس کے جسم پر پانچ جگہ گولیوں کے نشانات تھے۔ مرتے مرتے بھی انسپکٹر نے دیوار سے لٹکتے ہوئے ریوالور تک پہنچنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوا تھا۔ دونوں پولیس والوں نے بھی حملہ آوروں پر گولیاں چلائی تھیں لیکن اُن کا کوئی شخص زخمی نہیں ہوا تھا۔ حویلی کے اندر اور باہر بے شمار لوگ جمع تھے۔ مقامی تھانے کے اہلکار بھی پہنچ چکے تھے۔ یہ میرے لئے ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ انسپکٹر قربان علی میرا ساتھی ہی نہیں دوست بھی تھا۔ چند روز بعد بیچارے کی شادی ہونے والی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے قتل کر دیا گیا ہو۔ رات پچھلے پہر امرتسر سے ایس پی صاحب بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے خاص طور پہ مجھ سے ملاقات کی اور میری ڈھارس بندھانے کی کوشش کی۔ حالات سے صاف ظاہر تھا کہ حملہ آوروں نے جو بلا شبہ منوج اور اُس کے آدمی تھے، مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی..... اگر میں شدید طور پر زخمی نہ ہوتا تو شاید اُسی وقت ریوالور لے کر قاتلوں کی تلاش میں نکل جاتا لیکن پٹیوں میں جکڑا ہوا میرا بازو مجھے کچھ انتظار پر مجبور کر رہا تھا۔ اگلے روز شام تک انسپکٹر قربان علی کی تجہیز و تکفین مکمل ہو گئی۔ میں آنکھوں میں رنج والم کے ناقابلِ فراموش منظر سمیٹ کر حویلی میں آ گیا۔ ایس پی صاحب نے بہت کہا کہ میں

اُب تھانے واپس آجاؤں لیکن مَیں نے انہیں مجبور کرکے حویلی میں ڈیوٹی لگوائی۔ جو کہانی شروع ہوئی تھی اُسے انجام تک پہنچائے بغیر چھوڑ دینا اب میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ مَیں انسپکٹر قربان علی کے قاتلوں کو جلد از جلد کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اُن کی عبرتناک سزا ہی میرے زخموں پر مرہم رکھ سکتی تھی۔ اور زخموں کے مرہم کے لئے مجھے زخم مندمل ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

حویلی پر پولیس کا پہرہ موجود تھا۔ میرا بازو آہستہ آہستہ قابلِ حرکت ہو رہا تھا۔ ایک دن میں انسپکٹر قربان علی کی چھوڑی ہوئی فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ بلال شاہ چارپائی پر بیٹھا میری ٹانگیں دبا رہا تھا۔ اتنے میں حویلی کی بوڑھی خادمہ کی شکل نظر آئی۔ اس نے بتایا کہ "بی بی" آپ کو بُلا رہی ہیں۔ حویلی میں ایک ہی بی بی تھی یعنی جمنا۔ مَیں سوچنے لگا جمنا کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود اس نے ایک بار بھی میرا حال دریافت نہیں کیا تھا..... کسی بات پر معذرت نہیں کی تھی، شکریہ ادا نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اب بھی مجھے اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ کاؤ والے واقعے کے بعد صرف ایک دفعہ اُس سے میری بات ہوئی تھی اور وہ بھی تانگے پر آتے ہوئے راستے میں۔ مَیں نے کہا تھا "جمنا دیوی! جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے یہ اُس شخص کی آہ کا نتیجہ ہے جس پر تم نے جھوٹی تہمت لگا کر بے عزت کیا تھا۔ اگر تم میں ذرا بھی احساس ہے تو اُس شریف انسان کو ڈھونڈو اور اس کے قدموں میں گر کر معافی مانگو۔" وہ خاموشی سے دوسری طرف دیکھتی رہی تھی۔

مَیں اسی اُدھیڑ بن میں خادمہ کے ساتھ چلتا ہوا حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہوا۔ مجھے جمنا کے کمرے کے سامنے چھوڑ کر خادمہ چلی گئی۔ مَیں نے کھنکار کر اپنی آمد کی اطلاع دی اور پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ جمنا پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اُس کا رُخ دوسری طرف تھا۔ مَیں نے ایک بار

پھر کھنکار کر اُسے متوجہ کرنا چاہا لیکن وہ بدستور منہ پھیرے بیٹھی رہی۔ "کیا بات ہے جمنا دیوی؟" مَیں نے دیوی کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اُس نے منہ پھیرے بغیر ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ کاغذ پر لکھا تھا۔

"پیاری جمنی! حویلی میں میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ صرف اور صرف اُس بدنیت انسپکٹر کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اُس نے تایا جان کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور وہ اُس کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں۔ مَیں زیادہ صفائیاں پیش نہیں کروں گا صرف اتنا کہوں گا کہ بوٹا سنگھ سے نہ میرا تعلق تھا، نہ ہے اور نہ کبھی ہو گا۔ میں تمہیں دل وجان سے چاہتا ہوں اور اس بات کی گواہی تمہارا دل بھی دے گا۔ اپنے دل کی گواہی پر بھروسہ کرو، دُنیا کی باتوں پر نہ جاؤ۔ مَیں آج رات حویلی میں آ رہا ہوں۔ تمہیں ہمیشہ کے لئے یہاں سے لے جانے کے لئے۔ تم نے بڑے منشی کو نکال کر اچھا کیا ہے۔ اب تم آسانی سے اپنا حق اپنے ساتھ لا سکتی ہو۔ سامان باندھ کر تیار رہنا۔ مَیں آج رات تمہیں اس جہنم سے بہت دُور لے جاؤں گا اور ہاں آج کی رات اُس انسپکٹر کے بچے کی آخری رات ہو گی۔ اس دفعہ ہمارے پیار کا دشمن ہمارے انتقام سے نہیں بچ سکے گا....."

مَیں نے خط دوسری بار احتیاط سے پڑھا پھر جمنا سے پوچھا "اب مجھ سے کیا چاہتی ہو جمنا دیوی؟"

جواب دینے کی بجائے وہ یک دم اٹھی ایک نظر میری طرف دیکھا اور بھاگ کر میرے قدموں میں گر گئی۔ میں اس اچانک حملے سے گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ گھٹنوں میں منہ چھپائے اُونچی آواز میں رو رہی تھی۔ کچھ دیر میں تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا پھر آگے بڑھ کر اُسے شانوں سے اُٹھایا۔ "انسپکٹر صاحب! مجھے معاف کر دیں" وہ ہاتھ جوڑتے

ہوئے بولی "میں آپ کو غلط سمجھی تھی۔ مَیں نے آپ کی بہت بے عزتی کی ہے" اب وہ باقاعدہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ مَیں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا شانہ تھپتھپایا اور تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ میرے سامنے کُرسی پر بیٹھی تمام بات بتا رہی تھی۔ اُس نے اعتراف کیا کہ وہ آج رات گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ کمرے میں پڑے چار بڑے بڑے صندوق اُس کی بات کی تصدیق کر رہے تھے۔ اُس نے کہا۔

"انسپکٹر جی! میں کتنی ہی بُری سہی لیکن احسان فراموش نہیں۔ آپ کا احسان زندگی بھر میرے دِل پر نقش رہے گا۔ آپ نے جان پر کھیل کر ایک بے بس اور مجبور لڑکی کی عزّت بچائی تھی۔ وہ لڑکی آپ کو کیسے موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ کبھی نہیں"۔ وہ پھر سسکیاں لینے لگی "انسپکٹر جی! مَیں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا، آپ جو کہیں گے مَیں ویسا ہی کروں گی۔۔۔۔ آپ کے کہنے پر میں اندھے کنویں میں بھی چھلانگ لگا دوں گی، یقین نہیں تو آزما کر دیکھ لیں"۔ وہ دوپٹے کا کنارہ منہ میں دبائے زار وقطار رو رہی تھی۔ مَیں نے اُسے تسلّی تشفّی دی۔ جب وہ ذرا پُرسکون ہوئی تو میں اُسے رات کے متعلق ہدایات دینے لگا۔ وہ منوج سے سخت خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اُس کا کہنا تھا وہ ہٹ کا بڑا پکّا ہے۔ اُس نے آپ کو قتل کی دھمکی دی ہے اور وہ اِس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ وہ چاہتی تھی کہ مَیں آج رات کے لئے کہیں روپوش ہو جاؤں یا پھر مدد کے لئے پولیس کے اور آدمی منگوا لوں۔ مَیں نے اُسے کہا کہ پہلی بات تو میرے لئے کسی صُورت قابلِ قبول نہیں۔ ہاں اُس کے دوسرے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اضافی پولیس منوج کے لئے نہیں بوٹا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے لئے ہوگی۔ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ منوج، بوٹا سنگھ سے ملا ہوا ہے؟"

"ہاں جمنا" مَیں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ اگر تمہیں کوئی شک ہے تو وہ بھی آج رات رفع ہو جائے گا"

رات پُرسکون تھی۔ گاؤں کے لوگ دن بھر کی محنت کے بعد میٹھی نیند سو رہے تھے۔ دُور چوکیدار کی آواز آ رہی تھی "جاگدے رہنا"۔ میں جمنا کے کمرے میں اس کی چارپائی پر چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ عقب میں کھلنے والی کھڑکی میں سرخ رنگ کا ایک دوپٹہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ کھڑکی سے آنے والی چودھویں کے چاند کی کرنیں کمرے میں اندھیرے اُجالے کا پُراسرار کھیل کھیل رہی تھیں۔ منوج نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ اگر جمنا جانے کے لئے تیار ہو تو کھڑکی میں اپنا دوپٹہ باندھ دے۔ منوج کی ہدایت کے مطابق دوپٹہ موجود تھا۔۔۔۔ اور منوج کو اُس کے انجام کی طرف بُلا رہا تھا۔ اُس وقت گیارہ کا عمل ہوگا جب دروازے سے "چرچرچر" کی آواز سنائی دی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دو گھنٹے سے میں اسی آواز کا انتظار کر رہا تھا۔ قدموں کی دبی دبی آہٹ اور کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ ہماری توقع کے عین مطابق آنے والا محافظوں کی نظر سے بچنے کے لئے دروازے کی طرف سے آیا تھا۔ جونہی میں نے جسم پر تنی ہوئی چادر میں حرکت محسوس کی۔۔۔۔ میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میرا ایک ہاتھ فووارد کی گردن سے لپٹ گیا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کا ریوالور قابو میں کر لیا۔ حملہ آور اس اچانک افتاد سے پہلے تو بُری طرح گھبرایا لیکن پھر سنبھل گیا۔ اُس کے جسم میں وحشی گھوڑے کا سا زور تھا۔ میں اس کے قد کاٹھ سے پہچان چکا تھا۔ وہ منوج ہی تھا۔ وہ مجھے کبڈی کے انداز میں گھسیٹتا ہوا عقبی کھڑکی تک لے گیا۔ پھر عین کھڑکی پر پہنچ کر وہ گلا پھاڑ کر چیخا "بوٹے۔۔۔۔ بوٹے۔۔۔۔ سائیں۔۔۔۔ لاکھے"۔ وہ ساتھیوں کو

آوازیں دے رہا تھا۔ مَیں بھی یہی چاہتا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے مکانوں کی اوٹ سے دو تین جلتی ہوئی مشعلیں برآمد ہوئیں اور گھوڑوں کی ٹاپیں بوٹا سنگھ کی آمد کی خبر سنانے لگیں۔ لیکن مجھے ان لوگوں کی پرواہ نہیں تھی۔ اُن سے نپٹنے کا پُورا انتظام موجود تھا۔ حویلی کے اندر کوئی بیس پولیس والے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ مَیں نے اپنی توجہ منوج کی طرف مرکوز کر دی۔ وہ اپنے بازو کی پوری طاقت لگا کر ریوالور کا رُخ میری طرف موڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کام کر رہے تھے لیکن میرا ایک ہاتھ زخمی تھا۔ ایک لحاظ سے یہ ایک ہاتھ اور دو ہاتھوں کا مقابلہ تھا۔ کوئی آدھ منٹ تک یہ جان لیوا کشمکش جاری رہی لیکن پھر آہستہ آہستہ ریوالور کا رُخ میری طرف مڑنے لگا۔ منوج کے دماغ میں ایک ہی سودا سمایا ہوا تھا۔ وہ طاقت کے بل بوتے پر ریوالور کا رُخ میری طرف پھیرنا چاہتا تھا لیکن اس ضد میں وہ ایک بات بالکل فراموش کر چکا تھا...... وہ بالکل کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ عین اس وقت جب ریوالور کی نالی میری گردن پر چبھنے لگی تھی۔ مَیں نے جھٹکے سے منوج کو پیچھے کی طرف دھکیلا وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹکرایا اور اُلٹ کر دوسری منزل سے بیس فٹ نیچے پکے فرش پر جا گرا۔ اُس کی آخری چیخ بڑی بھیانک تھی۔ فرش پر گرتے ہی اُس کا منکا ٹوٹ گیا تھا۔ نیچے زمین کے خالی قطعے پر زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ پولیس والوں نے بوٹا سنگھ اور اُس کے ساتھیوں کو گھیر لیا تھا...... لیکن نہیں، بوٹا سنگھ اُن کے گھیرے میں نہیں آیا تھا۔ جونہی مَیں نیچے جانے کے لئے واپس مُڑا بوٹا سنگھ کو سامنے کھڑا پایا۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا اور چمکدار آنکھیں سانپ کی طرح حرکت کر رہی تھیں۔ کئی لوگ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ وہ آنکھیں نہیں جھپکتا لیکن میرے سامنے اُس نے کئی بار آنکھیں جھپکیں اپنا بوٹا سا قد لئے وہ مجھ سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اُس کی عیّاری

پولیس والوں میں ضرب المثل بن چکی تھی۔ اُس کی پھُرتی اور چالاکی سے میں اچھی طرح واقف تھا اور ایک دفعہ زک بھی اُٹھا چکا تھا۔ اس لئے اب میں تیار تھا..... بالکل تیار۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بوٹا اچانک جُھکا۔ قالین کا ایک کنارہ وہ ہاتھوں میں پکڑ چکا تھا۔ قدموں کے نیچے سے قالین دری وغیرہ کھینچنے کا داؤ بہت پُرانا تھا۔ لیکن ہوشیاری سے لگایا گیا تھا اگر میں تیار نہ ہوتا تو بوٹا مجھے گرا چکا تھا لیکن جونہی اُس نے قالین کو جھٹکا دیا میں ہَوا میں اُچھل گیا۔ بوٹا اپنے زور میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُٹھتا میرے بُوٹ کی دو زوردار ٹھوکریں اُس کے منہ پر پڑیں اور وہ چاروں شانے چِت ہو گیا۔

"سارے پولیس والے ایک سے نہیں ہوتے" میں نے اُس کے ہاتھوں سے خنجر چھینتے ہوئے کہا۔ وہ زمین پر پڑا خون تھوکتا رہا۔

جاگیردار کی صحت یابی کے بعد میں حویلی سے رخصت ہو گیا۔ جاگیردار کی پُرزور خواہش تھی کہ مَیں کچھ عرصہ اور اُن کے ہاں رُکوں۔ جمنا تو شاید یہ چاہتی تھی کہ میں ہمیشہ اپنی گارڈ کے ساتھ اُن کی حویلی میں موجود رہوں۔ ان دنوں میں اُس نے ہماری زبردست خاطر تواضع کی۔ مرغن کھانے کھا کھا کر سپاہی سست ہو گئے۔ اور بلال شاہ کی تو نکسیر پھوٹنے لگی۔ اس کا دِل وہاں اتنا لگا کہ جب ہم رخصت ہوئے تو وہ "باقاعدہ" آنسوؤں سے رونے لگا۔ مجھے رُخصت کرنے کے لئے علاقے کے معززین سمیت بہت سے افراد جمع ہو گئے تھے لیکن جمنا اُن میں نظر نہیں آئی..... اُس کے بعد میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ امرتسر کے ایک بازار میں منشی عطا سے میری مُلاقات ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ آج کل وہ جاگیردار کے پاس ہی ہے۔ جمنا نے بڑی کوشش

کے بعد اُسے ڈھونڈھ لیا تھا اور منت سماجت کر کے منا لائی تھی۔ اس کا گیارہ سالہ منگیتر حالانکہ برآمد ہو گیا تھا لیکن جاگیردار نے اُس کی شادی دہلی کے ایک ڈاکٹر سے کر دی تھی۔ منشی عطا کے مطابق وہ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی تھی۔ بوٹا سنگھ کو موت کی سزا ہوئی لیکن وہ ایک بار پھر جیل توڑ کر فرار ہو گیا۔ یہ ایک علیحدہ کہانی ہے پھر کسی وقت آپ کو سناؤں گا۔